ترجمان القرآن

فروری ۱۹۹۹

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

ارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد — نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۳۶ — فروری ۱۹۹۹، شوال ۱۴۱۹ — عدد ۲

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۷۸۴۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶۱ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطی، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

اشتراک لفظی ' اختلاف معنی

اگر مولانا [حسین احمد مدنی] صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے' تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ نہیں' کانگریس کی مراد بھی یہی ہے' اور کانگریس بالکل نبی صلعم کے اسوہ پر چل رہی ہے' اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اس متحدہ قومیت کے حوالے کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے۔ یہیں سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ "پانی ڈالنے" سے آپ کا مفہوم ذہنی "پانی ڈالنا" ہی ہو' لیکن دوسرے نے "آگ لگانے" کا نام "پانی ڈالنا" رکھ چھوڑا ہو' تو آپ کتنا ظلم کریں گے اگر اختلاف معنی کو نظرانداز کر کے لوگوں کو مشورہ دینے لگیں کہ اپنا گھر اس شخص کے حوالے کر دو جو "پانی ڈالنے" کے لیے کہتا ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے تو قرآن مجید میں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ایک لفظ ایک صحیح معنی اور ایک غلط معنی میں مشترک ہو جائے اور تم دیکھو کہ اعداء دین اس اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کر رہے ہیں تو ایسے لفظ ہی کو چھوڑ دو۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (البقرہ ۲:۱۰۴)۔ لہٰذا مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیے تحالف' یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیے تھا' اور اس وفاق یا تحالف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے تھا' نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امرا اور فاسق اہل سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علما کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (متحدہ قومیت اور اسلام' ابوالاعلیٰ مودودیؒ ' ترجمان القرآن ' جلد ۱۳' عدد ۶' ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ ' فروری ۱۹۳۹ء' ص ۴۷۹)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

سنگین معاشی بحران

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

خورشید احمد

پاکستانی معیشت قیام پاکستان ہی سے معاشی بحرانوں کی گرفت میں رہی ہے اور وقتی خوش حالی کے چند سالوں کو چھوڑ کر ملک کی عام آبادی مسلسل دباؤ کا شکار رہی ہے۔ لیکن معاشی بگاڑ' انتشار اور فساد نے اپنی وسعت' گہرائی اور تباہ کاری کے اعتبار سے جو صورت موجودہ حکومت کے دور میں اختیار کر لی ہے' خصوصیت سے ۱۹۹۸ میں' وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ بلاشبہ یہ صورت حال ان تمام حکمرانوں کی غلط پالیسیوں اور غلط کاریوں کا مجموعی (cumulative) نتیجہ ہے جن کے ہاتھوں میں گذشتہ چھبیس (۲۶) سال ملک کی زمام کار رہی ہے (اور خود موجودہ وزیراعظم اور ان کے رفقاے کار کم از کم پچھلے پندرہ سال میں مختلف حیثیوں میں اس حکمران ٹولے کا اہم حصہ رہے ہیں)۔ اس سنگین صورت حال کو محض ان معاشی پابندیوں کا نتیجہ بھی قرار دینا غلط ہو گا جو مئی ۱۹۹۸ کے جوہری تجربات کے بعد ملک پر لگائی گئیں۔ ان کے جزوی اثر سے انکار نہیں لیکن حالات کو مزید بگاڑنے میں خود حکومت کی پے بہ پے حماقتوں اور غلط اقدامات کا نمایاں دخل ہے۔

جس حقیقت کا غیر مشروط اعتراف وقت کی اہم ترین ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ آج کا سنگین معاشی بحران پورے معاشی نظام کے بگاڑ کی پیداوار ہے اور اگر اب بھی ہماری ملکی قیادت اصل خرابی اور [illegible] اسباب سے اغماض برتتی ہے اور محض مزید قرضوں اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے وقتی جان بخشی

(bail out) کے حربوں کے چکر میں گرفتار رہتی ہے تو اس دلدل سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ ملک آج نہیں تو کل دیوالیہ ہونے سے نہ بچ سکے گا۔ فیصلے کا لمحہ (moment of truth) آ چکا ہے۔ اب محض کام چلاؤ اور وقت گزاری کے اقدامات سے ہٹ کر بنیادی فیصلے ناگزیر ہو گئے ہیں' انھیں مزید ٹالا نہیں جا سکتا۔ واشنگٹن کے طواف اور عالمی مالیاتی اداروں کی منت سماجت اور ناز برداریاں اب زیادہ کام نہیں آ سکتیں۔ محض ٹیلی فون پر احکامات جاری کرنے اور نام نہاد کھلی کچہریاں لگانے سے بنیادی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ سارے نمایشی حربے بے کار اور غیر موثر ہو چکے ہیں۔ آج قوم اس نازک دوراہے پر کھڑی ہے جہاں زندگی اور موت اور آزادی اور غلامی کا فیصلہ ہونا ہے۔

یہ ایک تلخ اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ ملک کی قیادت (موجودہ حکومت اور اس کے پیش رو جو آج حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہے ہیں) معاشی مسئلے کے حل تو درکنار' اس کے صحیح ادراک کا بھی کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی ہے۔ حالات اس درجہ خراب ہو گئے ہیں کہ پوری معیشت جمود اور کساد بازاری (stagnation and recession) کا شکار ہے۔ سات سو سے زیادہ کارخانے بند پڑے ہیں' بار بار کے تخفیف قدر زر (devaluation) کے باوجود برآمدات میں اضافہ نہیں ہو رہا' بے روزگاری بڑھ رہی ہے' ملک کے بنک کاری نظام کو قرض نادہندگی کا گھن تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے' سرکاری ادارے خسارے میں ڈوب چکے ہیں' ٹیکسوں کی آمدنی سارے دباؤ کے باوجود کم ہو رہی ہے' افراط زر اور مہنگائی میں اضافہ ہو رہا ہے اور ملکی اور بیرونی قرضوں کا بوجھ ناقابل برداشت اور ان پر سود کی ادائیگی ناقابل عمل ہوتی جا رہی ہے۔ عالمی سطح پر ملک عملاً نادہندہ (defaultor) ہو چکا ہے۔ کم از کم ۷ بلین ڈالر کے فارن کرنسی اکاؤنٹ اور دو بلین ڈالر سے زیادہ کے واجب الادا قرض اپنے وقت پر ادا نہیں کیے گئے اور تین سے پانچ بلین ڈالر کی مزید ادائیگیاں سال رواں میں واجب الادا ہونے والی ہیں۔ مرکزی بجٹ کا ۴۵ فی صد (یعنی ۲۷۵ ارب روپے جو اب بھی دفاع کے بجٹ سے دوگنا ہے) صرف سود اور قرضوں کی ادائیگی کی نذر ہو جاتا ہے۔ اب اگر نظام میں تبدیلی نہیں ہوتی تو یہ حصہ ہر سال تیزی سے بڑھتا جائے گا اور سارے ہی بجٹ کو ہڑپ کر جائے گا۔

یہ تو ہے معیشت کلاں (macro economic) کی صورت حال۔ لیکن انسانی سطح پر صورت حال زیادہ دگرگوں ہے۔ غربت اور افلاس نے آبادی کے ۴۰ فی صد کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ لوگوں کو زندگی کی بنیادی سہولتیں حاصل نہیں ہیں اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ لوگ غربت سے تنگ آ کر خودکشی اور خود سوزی کا شکار ہو رہے ہیں' اور وہ بھی وزیراعظم کی کھلی کچہری

میں۔ یہ کل تک ایک مسلم معاشرے میں ناقابل تصور تھا۔ یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہترین زرعی، معدنی اور انسانی وسائل سے مالا مال کیا ہے اور جس کے بارے میں ابھی چالیس برس پہلے، اپنے ہی نہیں غیر بھی یہ پیشن گوئی کر رہے تھے کہ یہ ' ترقی پذیر دنیا کے لیے نمونے کا ملک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تعمیر اور ترقی کی جگہ بگاڑ اور فساد نے یہ گھمبیر صورت کیسے اختیار کی؟ اس کے بے لاگ تجزیے کی ضرورت ہے۔ ایک حقیقت پسندانہ تجزیے کی روشنی ہی میں بحران سے نجات اور مسائل کے حل کا کوئی واضح نقشہ بن سکتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے دوسرے دور یعنی ۱۹۷۲ سے اب تک کے بنیادی معاشی اعداد و شمار (indicators) پر ایک نگاہ ڈال لی جائے تاکہ مسئلے کی نوعیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جاسکے اور خرابی کی اصل جڑ کو متعین کر کے صحیح لائحہ عمل مرتب کیا جاسکے۔ (ملاحظہ کیجیے جدول 'پاکستانی معیشت کا اتار چڑھاؤ' اگلے صفحے پر)

پاکستانی معیشت کے اس چھبیس (۲۶) سالہ جائزے کے تجزیے سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اس پورے عرصے میں سائنسی بنیادوں پر ملک کی حقیقی ضرورتوں اور ترجیحات کے واضح تعین کے بعد مناسب منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ پہلے پندرہ برسوں میں یعنی ۱۹۸۷ تک عملاً طویل عرصے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوئی۔ سارا کاروبار سالانہ بجٹ اور سالانہ منصوبوں کی بنیاد پر چلتا رہا اور اس طرح عارضی اقدامات (adhocism) اور وقتی مصلحتیں پالیسیوں کا اصل محور رہیں۔ اس کے بعد برائے نام منصوبہ بندی شروع ہوئی مگر اس کا اصل مقصد زیادہ سے زیادہ بیرونی امداد اور قرضوں کا حصول تھا۔ حقیقی منصوبہ بندی سے یہ ملک مسلسل محروم رہا ہے۔

۲۔ ملک میں بنیادی معاشی ڈھانچے (economic infrastructure) کو ترقی دینے، بنیادی صنعتوں کو قائم اور مضبوط کرنے، زرعی پیداوار کو بڑھانے، روزگار فراہم کرنے، غربت دور کرنے، دولت کی تقسیم کو منصفانہ بنیادوں پر منظم کرنے اور عام شہریوں کو خوراک، تعلیم، صحت اور معاشی مواقع فراہم کرنے کا کوئی حقیقی اور دیرپا (sustained) پروگرام وضع نہیں کیا گیا۔ اس طرح معاشی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کا کام نظرانداز ہوا جس کے تلخ نتائج آج نظر آرہے ہیں۔ نمایشی ترقی اور صرف دولت مند اور بااثر طبقات کے مفادات کا تحفظ اور ایک مخصوص گروہ کو جلد از جلد امیر بن جانے کے مواقع فراہم کرنا

پاکستانی معیشت کا اتار چڑھاؤ

زمانہ	مجموعی ملکی پیداوار	فی کس پیداوار یا آمدنی	زرعی پیداوار کی ترقی کی رفتار	صنعتی پیداوار کی ترقی: کل صنعت	صنعتی پیداوار کی ترقی: بڑی صنعت	سرمایہ کاری کا تناسب	سرمایہ کاری کی پیداآوری	بے روزگاری کا تناسب	افراط زر کی شرح	تجارتی خسارے کا تناسب	بجٹ کے خسارے کا تناسب	زر کی رسد میں اضافے کی شرح	بیرونی قرضے (بلین میں)
1973-74 سے 1976-77	4.11	1.05	2.2	2.53	0.94	18.09	13	3.5	20.03	7.76	9.48	17.46	$4.022 1972-73
1977-78 سے 1987-88	6.56	3.48	3.9	9.17	9.47	18.78	17	3.60	7.31	9.61	7.20	17.38	$ 9.230 1977-78 $ 19.983 1987-88
1988-89 سے 1991-92	5.67	2.57	6.09	6.00	5.11	19.23	8.4	4.62	9.92	5.67	7.53	11.42	$24.602 1990-91
1992-93 سے 1994-95	3.73	0.78	1.94	4.55	2.94	19.61	3.8	4.98	11.31	4.74	6.49	20.72	$ 29.336 1993-94
1995-96 سے 1997-98	3.93	1.10	5 87	4.33	2.35	17.80	0.06	5.40	10.11	4.61	6.03	13.40	$ 31.633 1997-98

حکومت اور اس کے اداروں کا اصل ہدف رہے۔

۳۔ معاشی ترقی کے لیے خود انحصاری اور ملک میں ایسی استعداد پیدا کرنے کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا جس کے نتیجے میں وہ ایک طرف اپنی پیداآوری بنیاد (production base) کو مضبوط کر سکے تو دوسری طرف اپنے وسائل کے بل بوتے پر ترقی کی راہیں استوار کر سکے۔ اس کے برعکس بیرونی امداد اور بیرونی قرضوں کو ترقی کا محور اور مدار بنایا گیا۔ نتیجتاً بیرونی اور ملکی قرضوں کا اتنا بڑا بوجھ تو ملک پر لد گیا جو آج تین ہزار ارب روپوں سے تجاوز کر گیا ہے۔ یہ کل سالانہ قومی پیداوار سے بھی زیادہ ہے۔ اس پر صرف سود وغیرہ ادا کرنے کے لیے سال رواں میں ۲۷۵ ارب روپے درکار ہوں گے جو بجٹ کا ۴۵ فی صد اور دفاع کے اخراجات سے دوگنا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی معیشت وجود میں آئی ہے جو اپنی زندگی کے لیے دوسروں کی محتاج اور جس کی ملکی اساس نہایت کمزور اور ناقابل بھروسا (fragile) ہے۔ اس نے ہماری معیشت کو عملاً دوسروں کے ہاتھوں گروی رکھ دیا ہے اور ہماری سیاسی آزادی تک کو کمزور اور مجروح کر دیا ہے۔

۴۔ گذشتہ پندرہ سولہ سال سے جس حکمت عملی پر عمل ہو رہا ہے وہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی نام نہاد استحکام پیدا کرنے والی پالیسی (stabilisation policy) کہلاتی ہے جس میں اصل زور بجٹ کے خسارے کو کم کرنے' افراط زر کو روکنے اور نج کاری اور قرضوں پر مبنی سرمایہ کاری پر ہے۔ لیکن صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں بیرونی قرضے تو بے پناہ بڑھ گئے ہیں مگر عملاً بے روزگاری اور غربت میں اضافہ ہوا ہے' فی کس آمدنی میں اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے اور شرح اضافہ ۱۹۷۷-۷۸ سے ۱۹۸۷-۸۸ کے دس برسوں کے مقابلے میں ۱۹۸۸-۹۸ کے دس برسوں میں نصف رہ گئی ہے۔ صنعتی پیداوار خصوصیت سے بڑی صنعت کی پیداوار غیر تسلی بخش رہی ہے۔ سرمائے کی پیدا آوری میں مسلسل کمی ہوئی ہے جو پیدا آوری عدم صحت کی علامت ہے۔ بجٹ کے خسارے میں بھی مطلوبہ کمی واقع نہیں ہو سکی اور افراط زر بھی ۱۹۷۹-۸۹ کے اوسط (۹.۶۱ فی صد) سے زیادہ (۱۰.۴۷ فی صد) رہا ہے۔ یہ سرکاری اعداد و شمار ہیں ورنہ آزاد معاشی ماہرین کی نگاہ میں عملاً افراط زر اس شرح سے کم از کم ۵۰ فی صد زیادہ رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آئی ایم ایف کی حکمت عملی یکسر ناکام رہی ہے۔

۵۔ ان چھبیس برسوں میں جن پالیسیوں پر عمل ہوا ہے اس کے نتیجے میں ملک میں غربت میں اضافہ ہوا ہے اور دولت کی تقسیم مزید غیر مساوی ہو گئی ہے۔ صحیح اعداد و شمار کی کمی خود ایک بڑا مسئلہ ہے لیکن جو معلومات بھی موجود ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ آمدنی پر مبنی غربت جس میں ۱۹۷۵ اور ۱۹۹۰

کے درمیان کمی ہوئی تھی' ۱۹۹۰ کے بعد پھر اس میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر ۱۹۹۰ میں ۲۰ فی صد آبادی آمدنی کے خط افلاس' (poverty line) کے نیچے تھی تو یہ تعداد بڑھ کر ۱۹۹۵ میں ۳۰ فی صد اور ۱۹۹۸ میں ۳۸ فی صد ہو گئی ہے۔ گویا ان ۸ سالوں میں غربت میں تقریباً دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ گھریلو آمدنی کے تمام جائزے صرف غربت میں اضافے ہی کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ دولت کی تقسیم میں بھی ارتکاز ظاہر کر رہے ہیں۔ اس طرح امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہے ہیں (ملاحظہ کیجیے آکسفورڈ پریس کی تازہ ترین کتاب Human Development in South Asia 1998 مرتبہ: محبوب الحق' خدیجہ حق' ص ۱۷)۔

یہ تو وہ بنیادی خامیاں ہیں جو آئی ایم ایف / ورلڈ بنک کی عطا کردہ استحکام پرور اور اسٹرکچرل تبدیلی پر مبنی پالیسی کے فطری نتیجے کے طور پر رونما ہوئی ہیں۔ یہ ہماری قومی ترجیحات سے بدیہی طور پر متصادم ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی روشنی میں بنیادی پالیسی کے امور پر از سرنو غور ہو اور طویل مدت کی اصلاحات اور فوری اصلاحات دونوں کے لیے ایک نیا فریم ورک مرتب کیا جائے۔ لیکن بات نامکمل رہے گی اگر چند دوسری بنیادی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی نہ کی جائے جو اس درآمدہ پالیسی کے نقصانات اور قباحتوں کو دوچند کرنے کا سبب بنیں اور جن کی وجہ سے ہمارا معاشی سفر صحیح سمت اختیار ہی نہیں کر سکا۔

بدقسمتی سے اس پورے دور میں معاشی نظام کا کوئی تصور مفقود رہا ہے۔ پاکستان کا قیام ایک ایسے معاشرے اور معیشت کو وجود میں لانے کے لیے تھا جو اسلام کے اصول انصاف و اخوت پر مبنی ہو۔ اقبال اور قائداعظم کا نام تو ہماری قیادتوں نے دل کھول کر لیا ہے مگر ان کے بتائے ہوئے مقاصد اور اہداف سے عملاً کوئی دلچسپی انھوں نے نہیں دکھائی بلکہ ساری کارروائی ان کے برعکس ہی ہوتی رہی۔ اقبال نے مسلمانوں کے اسلامی تشخص' اسلامی قانون کے احیا' غربت و افلاس سے مسلمانوں کی نجات اور انھیں اس خطے میں قیادت و سیادت کے لائق بنانے کو پاکستان کا مقصد قرار دیا تھا اور اپنے ۱۹۳۰ کے معروف خطبہ الہ آباد اور قائداعظم سے خط و کتابت میں ان چاروں امور کو بہت صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیا تھا۔ خود قائداعظم نے سرمایہ داری' جاگیرداری اور اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کے عادلانہ معاشی نظام کے قیام کو پاکستان کی منزل قرار دیا تھا اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات اور غریب عوام کی خدمت اور انھیں معاشی مواقع فراہم کرنے کو اپنا مشن قرار دیا تھا۔ ان کے الفاظ ذہنوں میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقع پر انھوں نے کہا تھا:

مغرب کے اقتصادی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں اور ہم میں سے بیشتر کو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کو جو تباہی درپیش ہے' ایک معجزہ ہی اسے' اس سے بچا سکتا ہے۔ یہ انسان اور انسان کے درمیان عدل قائم کرنے میں اور بین الاقوامی دائرے میں تنازعات دور کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مغرب کے اقتصادی نظریے اور عمل کو اختیار کرنے سے ہم خوش اور مطمئن افراد تیار کرنے کا مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنی تقدیر اپنے طریقے سے بنانا چاہیے اور دنیا کے سامنے اسلام کا مساوات اور عدل اجتماعی کے تصورات پر مبنی معاشی نظام پیش کرنا چاہیے۔

انھوں نے غربت کے خاتمے اور غریبوں کی فلاح کو اپنی ترجیح قرار دیا تھا:

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے کہ اس عمر میں آسایش کے ساتھ زندگی گزاروں۔ میں کیوں اتنی تکلیف اٹھاؤں' دوڑ بھاگ کروں اور خون پسینہ ایک کروں۔ سرمایہ داروں کے لیے نہیں بلکہ آپ کے جیسے غریب افراد کے لیے۔ میں نے عوام کی حد درجہ غربت کو دیکھا ہے' ان میں سے کچھ کو ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ مجھے اس کا احساس ہے اور ہم پاکستان میں ہر شخص کے لیے باعزت زندگی فراہم کرنے کی خاطر جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے' کریں گے۔ (کلکتہ میں مسلم لیگ کے کارکنوں سے خطاب' یکم مارچ ۱۹۴۶)

۱۱/اگست ۱۹۴۷ کے قومی اسمبلی کے خطاب میں فرمایا:

اب اگر ہم پاکستان کی اس عظیم مملکت کو خوش حال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں لوگوں کی خصوصاً عوام کی اور غریبوں کی بہتری اور بھلائی پر مکمل طور پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

قائداعظم نے ان طبقات کی بھی نشاندہی کی تھی جو ترقی کی راہ میں اصل رکاوٹ ہیں لیکن قائد کے نام لیواؤں نے انھی کو مضبوط کیا جو ظالم تھے اور جن کے چنگل سے نجات کے لیے آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی:

اب میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں جو ایک ایسے نظام کی بدولت جو انتہائی سفاک اور چالاک ہے ہماری قیمت پر پھل پھول رہے ہیں۔ اس نے ان کو اتنا خود غرض بنا دیا ہے کہ ان سے معقول بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ عوام کا استحصال کرنا ان کے خون میں شامل ہو گیا ہے۔ انھوں نے اسلام کے سب سبق بھلا دیے ہیں۔ لالچ اور خود غرضی نے ان کو دوسروں کی بھلائی سے بے تعلق کر دیا ہے' انھیں صرف اپنی فکر ہے۔ آپ دیہات کے کسی حصے میں چلے جائیں' میں دیہاتوں میں گیا ہوں' ہمارے لاکھوں آدمی ایسے ہیں جنھیں ایک وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ کیا یہ تہذیب ہے؟ کیا یہ پاکستان کا مقصد ہے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ لاکھوں آدمیوں کا استحصال کیا گیا

ہے اور انھیں ایک وقت کا کھانا نہیں ملتا۔ اگر پاکستان کا یہ تصور ہے تو مجھے نہیں چاہیے۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے اجلاس میں صدارتی خطاب' ۲۴ اپریل ۱۹۴۶)

قائداعظم کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ پاکستان کو دوسروں کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ محض نج کاری مسائل کا حل نہیں' ریاست کا بھی ایک مثبت رول ہے جو اسے دیانت اور اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ کو ولیکا ٹیکسٹائل ملز کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا کہ صنعتی ترقی کا مقصد دوسروں پر ہماری محتاجی کو کم کرنا ہونا چاہیے تاکہ ہم دنیا میں اپنے مقام کے مطابق کردار ادا کر سکیں۔ نیز منصفانہ ٹیکس سسٹم کے قیام' سماجی انصاف کے حصول اور اہم صنعتوں اور عوامی خدمت (public utilities) کے پیداواری اداروں کے سرکاری انتظام اور کنٹرول میں رکھنے کی اہمیت واضح کی تھی (انٹرویو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ' ۵ نومبر ۱۹۴۵)۔ لیکن ان تمام باتوں کو پچھلے ۵۰ سال میں بھلا دیا گیا اور اس جاگیردارانہ' سرمایہ دارانہ نظام کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جو ہماری معاشی مشکلات کی جڑ ہے۔ آج چند ہزار خاندان ملک پر قابض ہیں' اور اس کے سارے وسائل سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جبکہ عوام کس مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی خاندان زراعت' صنعت اور تجارت پر قابض ہیں۔ یہی سیاست اور اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں کی زینت ہیں' انھی کے سپوت انتظامیہ' فوج اور پولیس کے اعلیٰ کارپرداز ہیں' یہی بنکوں سے استفادہ کرنے والے اور ان کے اعلیٰ ترین نادہندہ ہیں۔ قومی دولت کے ۸۰ فی صد پر ان کا قبضہ ہے اور اربوں ڈالر یہ ملک سے باہر لے گئے ہیں (جگہ کی قلت تفصیلات دینے سے مانع ہے۔ حال ہی میں دو اہم کتابیں شائع ہوئیں جن میں اس گروہ کی کارفرمائیوں کی کچھ تفصیل موجود ہے۔ ان کا مطالعہ مفید ہو گا۔ عقیل عباس جعفری کی کتاب "پاکستان کے سیاسی وڈیرے" اور شاہد الرحمٰن کی کتاب' Who Owns Pakistan)۔ جب تک یہ ظالمانہ نظام باقی ہے اور یہ قبضہ گروپ برسراقتدار ہے' اقبال اور قائداعظم کے تصور کا پاکستان وجود میں نہیں آ سکتا۔

اس ظالمانہ نظام ہی کا ایک پہلو وہ بددیانتی' کرپشن اور لوٹ مار ہے جو ہر سطح پر جاری ہے اور جس کے نتیجے میں ملکی وسائل کا ایک معتدبہ حصہ' مفاد پرست طبقہ عوام کا حق مار کر اپنے تصرف میں رکھے ہوئے ہے۔ کرپشن کا کم سے کم اندازہ ۵ سو ارب روپے سالانہ ہے جو ملکی بجٹ کا ۹۰ فی صد ہے اور زیادہ لبرل اندازہ ڈیڑھ ہزار ارب سالانہ ہے جو قومی پیداوار کا ۵۷ فی صد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ کئی سال سے پاکستان کا شمار دنیا کے بدعنوان ترین ممالک میں سرفہرست آ رہا ہے۔

اگر کرپشن اور سود کی لعنت سے نجات حاصل کر لی جائے تو ان سے حاصل ہونے والے وسائل چند برسوں میں ملک سے غربت کے خاتمے کا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب حقیقی اقتدار ملک کے عوام تک منتقل ہو اور ان کی آواز عملاً موثر بن سکے۔ ملک کو دیانت دار اور لائق قیادت میسر ہو جو لوٹنے والوں کا موثر احتساب کرے اور ایک مکمل طور پر شفاف (transparent) نظام حکومت قائم کرے جس میں قیادت عوام میں سے ہو' عوام کی حقیقی خادم ہو اور ان کے اور خدا کے سامنے پورے طور پر جواب دہ ہو۔ قیادت کی اس تبدیلی کے ذریعے ہی جبر و ظلم کے نظام کو بدلا جا سکتا ہے اور عدل و انصاف پر مبنی نظام قائم ہو سکتا ہے۔

صحیح معاشی ترجیحات کا تعین بھی اس عمل کا ایک اہم حصہ ہے۔ حقیقی خود انحصاری اور معاشی ترقی کے رخ کو عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے پیدا آوری نظام کے قیام کے لیے موڑنا وقت کی ضرورت ہے۔ قرضوں پر مبنی ترقیاتی حکمت عملی ناکام رہی ہے اور اس نے ہمارے ملک کو ایک ایسا مریض بنا دیا ہے جس کی زندگی کا انحصار مسلسل بیرونی آکسیجن کے حصول پر ہے۔ وقت آگیا ہے کہ قوم قرضوں سے نجات اور خود انحصاری پر مبنی معیشت کے قیام کا بنیادی فیصلہ کرے۔ اس کے لیے ڈیفالٹ (default) ضروری نہیں۔ دنیا کے ۳۲ ممالک نے صرف گذشتہ ۱۵ سال میں اپنے قرضوں کی ادائگی کا نیا نظام الاوقات بنوایا ہے اور کم از کم ۱۱ نے تو ڈیفالٹ کا راستہ بھی اختیار کیا ہے۔ ہمیں بہترین اور بدترین دونوں امکانات (scenarios) کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے۔ لیکن اصل عزم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے وسائل کے اندر رہ کر جینے کا طریقہ اختیار کریں اور صرف وہ قرض حاصل کریں جو پیدا آوری صلاحیت میں اتنا اضافہ کرتا ہو کہ اسے بہ خوبی واپس کیا جا سکتا ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں قرضوں کی سیاست نے جو اندھا کھیل کھیلا ہے اس میں پیدا آوری صلاحیت کی ترقی کو کوئی مقام حاصل نہ تھا بلکہ ہم تو عام انتظامی اخراجات سودی قرض سے لے کر چلا رہے ہیں اور بھول گئے ہیں کہ:

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

"وہ ایک دن" کبھی کا آچکا مگر قیادت اب بھی مزید قرض لے کر ہی زندگی کے لمحے مستعار لینے پر مصر ہے۔ یہ خودکشی کا راستہ ہے' ترقی کا نہیں۔

موثر نظام احتساب کی کمی بھی خرابیوں کو پروان چڑھانے اور بگاڑ کے بے روک ٹوک بڑھتے جانے کا سبب ہے۔ اس وقت جس چیز کو احتساب کہا جا رہا ہے وہ ایک مذاق اور ڈھونگ ہے۔ دونوں بڑی پارٹیاں'

جو بدعنوانی میں ایک دوسرے کی مثل ہیں' اپنے اپنے دور اقتدار میں اپنے حریف کو مقدمات میں الجھانے کا ڈراما کر رہی ہیں لیکن حقیقی احتساب کسی کا بھی نہیں ہوا اور نہ اس طریقہ کار سے ہو سکتا ہے۔ احتساب سب کا ہونا چاہیے اور اس کے لیے وہی نظام موثر ہو سکتا ہے جو مکمل طور پر آزاد ہو' اس کی گرفت سے کوئی بھی باہر نہ ہو۔ یہ احتساب وہی کر سکتا ہے جس کا اپنا دامن پاک ہو۔ جس حمام میں سب ننگے ہوں وہاں احتساب کا کیا تصور؟ سب جانتے ہیں کہ بے نظیر صاحبہ اور پی پی پی کے ٹولے نے ملک کو کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور کتنی دولت ملک سے باہر لے گئے۔ لیکن دو سال ہو رہے ہیں اور سارے شور شرابے کے باوجود ملکی خزانے کی ایک کوڑی بھی ان سے واپس نہیں لی جا سکی ہے۔ یہی وزیراعظم صاحب کے خاندان کی صورت ہے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۰ ارب کے قرضے صرف بنک کاری کے نظام سے لیے ہوئے ہیں جس کے وہ نادہندہ ہیں (لطف یہ ہے کہ صرف یہ رقم کل نادہندہ قرضوں کا پندرھواں حصہ ہے) لیکن وصولی صفر ہے۔ اسراف کا بازار اسی طرح گرم ہے۔ ایوان صدر اور وزیراعظم کے دفتر کے اخراجات ۲ ارب روپے سالانہ سے زیادہ ہیں جو صحت کے پورے مرکزی بجٹ سے زیادہ ہیں۔ وزارت اطلاعات جو صرف سرکاری پروپیگنڈے میں مصروف ہے' اس کا بجٹ ایک ارب روپے سالانہ ہے جبکہ ملک میں تحقیق (research and development) کا پورا بجٹ صرف ۱۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے ہے۔ پارلیمنٹ خود اس بندر بانٹ میں شریک ہے۔ وہ نہ معاشی ترجیحات کو درست کرنے میں کوئی کردار ادا کر رہی ہے اور نہ بدعنوانی کے خاتمے اور احتساب کے لیے کسی موثر نظام کو قائم کرنے میں ہی اسے کوئی دلچسپی ہے۔ بات پھر سیاسی ارادے (political will) اور تبدیلی قیادت پر آجاتی ہے جس کے بغیر قومی زندگی میں کسی نئے باب کا کھلنا محال ہے۔

ایک اور' بہ ظاہر ضمنی لیکن فی الحقیقت' بڑی اہم چیز حقائق سے اغماض ہے۔ صحیح معلومات اور اعداد و شمار کا کوئی قابل اعتماد نظام موجود نہیں۔ شماریات کا شعبہ حکومت کے اشارہ چشم و ابرو کو دیکھتا ہے اور اسٹیٹ بنک تک جزوی آزادی کے حصول کے باوجود آزاد رائے دینے سے احتراز کرتا ہے۔ پالیسی سازی پر کھلی بحث نہ ہونے کے برابر ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی تو حکومت کے قبضے میں ہیں' پریس کو بھی طرح طرح سے قابو میں کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کا فورم غیر موثر ہو گیا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر عوام کی رائے حاصل کرنے اور پبلک مباحثے اور مشاورت کے ذریعے پالیسی سازی کا کوئی وجود نہیں۔ اہم بین الاقوامی معاہدے تک نہ قوم کے علم میں لائے جاتے ہیں اور نہ پارلیمنٹ میں ان پر بحث

ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کابینہ کے بند کمروں میں یہ فیصلے ہو جاتے ہیں بلکہ صحیح تر بات تو یہ ہے کہ بس کابینہ کو بھی مطلع کر دیا جاتا ہے' ورنہ اصل فیصلے تو چند افراد بالا ہی بالا کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ملک میں کھلی حکمرانی (open government) جو اچھی حکمرانی (good government) کی روح ہے' مفقود ہے۔ یہ کرپشن اور آمرانہ رجحانات کو پروان چڑھانے کا اہم سبب ہے۔

موجودہ معاشی دلدل سے نکلنے اور معاشی زندگی کی تعمیر نو کے لیے جن اقدامات کی ضرورت ہے ان میں سب سے پہلا مرحلہ معاشی نظام اور اس کے مقاصد اور ترجیحات کا صحیح وژن (vision) ہے۔ موجودہ حکومت کے پاس کوئی واضح وژن نہیں۔ اس حکومت اور اب تک کی دوسری حکومتوں نے عملاً جو کچھ کیا ہے وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا استحکام اور ایک قسم کی سیاسی اور معاشی چند شخصی نظام (aristocracy) کا فروغ ہے۔ وقت کی پہلی ضرورت نئے نظام کا واضح تصور ہے جس کے ضروری خدوخال ہم نے موجودہ نظام پر اپنی تنقید اور اقبال اور قائداعظم کے استفسارات کی روشنی میں بیان کر دیے ہیں۔ اس نئے وژن کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

دوسری ضرورت اس وژن کی روشنی میں تفصیلی پالیسی سازی اور معاشی حکمت عملی کا تعین ہے۔ الحمدللہ اس سلسلے میں نظری کام ضروری تفصیل کے ساتھ پاکستان میں تحریک اسلامی اور عالمی اسلامی تحریکات سے ہم نوا تحقیقی اداروں اور محققین نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں وسیع لٹریچر موجود ہے جس سے رہنمائی لے کر ایک اچھی حکومت بہت کم وقت میں تفصیلی پروگرام بنا سکتی ہے۔

تیسری اور اہم ترین ضرورت نئی سیاسی اور معاشی قیادت ہے جو موجودہ نظام کو چیلنج کر سکے اور نیا نظام قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکے۔ ملک کی موجودہ سیاسی قیادت اپنی ساکھ اور وژن کھو چکی ہے۔ اسے ملک اور ملک سے باہر اس کی کوئی ساکھ 'creditbility' نہیں رہی۔ نیز گذشتہ پندرہ سال میں اس نے جس صلاحیت اور کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی روشنی میں اس سے کوئی امید قائم کرنا "آزمائے ہوئے کو مزید آزمانے کی حماقت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا: آزمودہ را آزمودن جہل است۔

اب نجات کا راستہ اگر کوئی ہے تو ایک نئی قیادت کو برسراقتدار لانا ہے جو اس وژن کے مطابق ایک طرف ماضی کی قیادتوں کا موثر احتساب کر سکے اور دوسری طرف نئی تعمیر کا کام انجام دے سکے۔

موجودہ سنگین معاشی بحران سے نکلنے کا راستہ یہی ہے۔

انسان کی یہ بڑی **خوبی** ہے

کہ

اسے معلوم ہو

کہ

اسے

کون سی بات

کہاں

کتنی

کس انداز سے

کہنا ہے

15

حکمت مودودیؒ

فتنے کی جڑ

دنیا میں فتنے کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے' خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس [فساد] کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے' مگر اب تو ہزارہا برس کے تجربے سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا الٰہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے الٰہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔ آج بھی آپ جدھر نگاہ ڈالیں گے یہی نظر آئے گا کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر براجمان ہے' اور کہیں کوئی ڈکٹیٹر مَا عَلِمۡتُ لَكُمۡ مِّنۡ إِلَٰهٍ غَيۡرِيْ [القصص ۲۸: ۳۸' "میں تو اپنے سوا تمھارے کسی خدا کو نہیں جانتا"] کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیراعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں نہیں رہ سکتا' اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں ظلم' طغیان' ناجائز انتفاع' بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ انسان کے دل و دماغ پر' اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر ہی رہیں جنھوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقا کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:

قال اللہ عزوجل انی خلقت عبادی حنفاء فجاء تھم الشیطین فاجتالتھم من دینھم وحرمت

علیھم ما احللت لھم (حدیث قدسی)

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا۔ پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا' انھیں فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا' ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب' اس کی ساری تباہیوں' اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے۔ یہی وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو' اس کی علمی و فکری قوتوں کو' اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو' اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو' اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانے سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لیے نہیں ہے کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا (اسلامی ریاست' ص ۱۲۱-۱۲۳)۔

امت مسلمہ کا مقام

سید قطب شہیدؒ

ترجمہ: سید حامد علیؒ

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط (البقرہ ۲: ۱۴۴)

تو اپنا رخ مسجد حرام کی جانب کر لو۔ اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنا رخ مسجد حرام کی جانب کرو۔

تحویل قبلہ کی حکمت

اب ہم تحویل قبلہ، اور مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص قبلہ قرار دیے جانے کی ----- جس کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھیں ----- حکمت بیان کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ امت مسلمہ کی تاریخ کا بہت اہم واقعہ تھا اور امت کی زندگی پر اس واقعے کے عظیم اثرات مرتب ہوئے۔

سب سے پہلے قبلے کی تبدیلی خانہ کعبہ سے بیت المقدس کی جانب ہوئی۔ اس تبدیلی کی غرض و غایت امت کی تربیت تھی۔ اس غرض کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ط (البقرہ ۲: ۱۴۳)

جس قبلے پر تم پہلے تھے، اسے ہم نے اس لیے قبلہ ٹھیرایا تھا کہ ہم ان لوگوں کو، جو رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں، ان لوگوں سے ممتاز کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جانے والے ہیں۔

اہل عرب زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کی عظمت کرتے اور اسے اپنے قومی مجد و شرف کا عنوان تصور کرتے تھے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل غیراللہ سے بالکلیہ کٹ کر اللہ کے لیے خالص ہو جائیں۔ وہ اسلامی نظام کے سوا ----- جس کا صرف خدا سے ربط ہے اور جو تاریخی، نسلی اور وطنی وابستگیاں نہیں رکھتا ----- ہر دوسری چیز کی عصبیت اور ہر دوسرے نعرے سے انسان کو دور رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنے سے انھیں روک دیا اور کچھ عرصے کے لیے مسجد اقصیٰ کو ان کا قبلہ قرار دیا تاکہ ان کے دل جاہلیت کی آلودگیوں اور ان تمام امور سے پاک ہو جائیں جن کا جاہلیت

سے کوئی تعلق ہے' اور یہ ظاہر ہو جائے کہ کون شخص دوسرے تمام عوامل کے اثر سے پاک ہو کر خالصتاً رسولؐ کا اتباع کرتا ہے' ایسا اتباع جو پوری خوش دلی سے ہو' جس میں انسان نے خود کو بالکلیہ رسولؐ کے حوالے کر دیا ہو اور جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ اور وہ لوگ بھی معلوم ہو جائیں جو جاہلیت کے کسی نعرے پر ----- جس کا تعلق' قوم' وطن یا تاریخ سے ہو ----- فخر کرنے یا اپنے احساسات اور دل کے مخفی گوشوں میں جاہلیت سے کسی قوم کا تعلق رکھنے کی بنا پر الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔

جب مسلمانوں نے اپنے آپ کو بالکلیہ رسولؐ کے حوالے کر دیا اور اس قبلے کی طرف رخ کرنے لگے جس کا حکم انھیں رسولؐ نے دیا تھا' ساتھ ہی یہود اس معاملے کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل بنانے لگے تو مسجد حرام کو قبلہ بنانے کے لیے اللہ کا حکم آیا' لیکن اس طرح کہ اس نے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی حقیقت پیوست کی اور ان پر واضح کیا کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے اس گھر کی تعمیر اس لیے کی تھی کہ وہ خالصتاً اللہ کے لیے ہو' اور اس امت مسلمہ کی میراث بنے جو حضرت ابراہیمؑ کی' اپنے رب سے دعا کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ جیسا کہ اس سے قبل گذشتہ پارے میں وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط (البقرہ ۲: ۱۲۴)' اور اس کے بعد کی آیات سے سامنے آ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں ایک رسول انھی میں سے' اس اسلام کے ساتھ مبعوث فرمائے' جو ان کا اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کا دین ہے (اور وہ امت مسلمہ کی تشکیل کرے)۔

حقیقت یہ ہے کہ مسجد حرام کی تعمیر اور وہ معاملات و کیفیات' جن میں اس کی تعمیر ہوئی' ان امور کا تذکرہ اور حضرت ابراہیمؑ' ان کی اولاد اور ان کے دین' ان کے قبلے' ان کے عہد' اور ان کی وصیت کے سلسلے میں اہل کتاب اور مشرکین سے بحث' جو اس سے قبل اسی سورت میں گزر چکی' مسجد اقصیٰ کو بدل کر مسجد حرام کے قبلہ بنائے جانے کے ذکر کے لیے بہترین تمہید ہے۔ مسجد حرام کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام نے کی تھی اور اسے تعمیر کرتے وقت انھوں نے وہ طویل دعا کی تھی جو گزر چکی ہے ----- جس کا ایک جز یہ تھا کہ ان کی نسل میں سے امت مسلمہ کی تشکیل ہو ----- اس مسجد حرام کا امت مسلمہ کے لیے ----- جو حضرت ابراہیمؑ کے دین اور ان کے' اپنے رب کے ساتھ عہد کی وارث ہے' قبلہ بنایا جانا بالکل فطری اور منطقی عمل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس تاریخ سے مومن کو کعبے سے جو فکری وابستگی پیدا ہوتی ہے' کعبے کی طرف رخ کرنا اس سے ہم آہنگ حسی وابستگی ہے۔

اللہ نے ابراہیم علیہ السلام سے عہد لیا تھا کہ وہ مسلمان رہیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے عہد لیا تھا کہ وہ ان کے بعد اسی اسلام کے راستے پر چلتے رہیں گے۔ اسی بات کا عہد یعقوب علیہ السلام نے ----- جن کا لقب اسرائیل ہے ----- اپنے بیٹوں سے لیا تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو علم تھا کہ اللہ کے عہد اور اس کے فضل میں ظالموں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

اللہ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے اس بات کا عہد بھی لیا تھا کہ وہ خانہ کعبہ کی تعمیر کریں گے۔ اس لیے یہ گھران دونوں کی میراث ہے اور اس کے وارث وہی لوگ ہوں گے جو ان دونوں کے ساتھ اللہ کے عہد کے وارث ہوں گے۔ یہ امت مسلمہ ہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے اللہ کے عہد اور ان پر اللہ کے فضل کی وارث ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری اور منطقی بات ہے کہ امت مسلمہ مکہ میں موجود' اللہ کے اس گھر کی وارث ہو اور وہ اسے اپنا قبلہ بنائے۔

کچھ عرصے تک مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کے قبلے' مسجد اقصیٰ کی طرف بھی رخ کیا۔ ایسا ایک خاص حکمت کے تحت ہوا تھا جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ امت مسلمہ کو حضرت ابراہیمؑ کی وراثت عطا کرے' اہل کتاب نے اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے دین "اسلام" کی طرف واپس آنے سے انکار کر دیا تھا ورنہ وہ بھی اس میراث میں شریک ہوتے' تو قبلے کی تبدیلی ٹھیک اس کے وقت میں ہوئی' اور اللہ کا پہلا گھر' جسے ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا' مسلمانوں کا قبلہ بنا۔ تاکہ مسلمان وراثت کی ساری خصوصیات ----- حسی اور فکری ----- کے حامل ہوں اور دین کی وراثت اور اللہ کے فضل کی وراثت ----- سب وراثتیں پاکر ممتاز ہو سکیں۔

امتیازات اور ظاہری اشکال کی اہمیت

امتیاز امت مسلمہ کے لیے ضروری ہے' تصورات اور معتقدات میں بھی اور قبلہ اور عبادات میں بھی۔ ان سب امور میں امت مسلمہ کا' دوسروں سے ممتاز اور جداگانہ خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ تصورات و معتقدات سے متعلق تو بات بالکل واضح ہے مگر قبلہ اور عبادات کے سلسلے میں بات اس قدر واضح نہیں ہے۔ اس لیے ہم عبادات کی شکلوں کی قدر و قیمت پر ایک اچٹتی نظر ڈالیں گے۔

جو لوگ گرد و پیش کے حالات اور نفس انسانی کی فطرت اور اس کے تاثرات سے صرف نظر کر کے صرف ان اشکال پر نظر ڈالتے ہیں' تو انھیں بسااوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ عبادات کی ظاہری شکلوں پر اصرار کرنے میں کچھ تنگ نظرانہ تعصب ہے یا ایک طرح ان اشکال کی پرستاری ہے۔ لیکن زیادہ وسیع نظر اور فطرت انسانی کی طبیعت کے' زیادہ گہرے فہم و ادراک سے کچھ دوسری حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

انسان کی ساخت ظاہری جسم اور باطنی روح سے ہوئی' اس لیے نفس انسانی میں اس بات کا فطری میلان ہے کہ مخفی احساسات کو نمایاں کرنے کے لیے ظاہری شکلیں اختیار کرے۔ یہ مخفی احساسات اس وقت تک سکون نہیں پاتے جب تک وہ ایسی ظاہری شکل اختیار نہ کرلیں جو حواس سے محسوس ہوتی ہو۔ مخفی احساسات بھی اسی وقت پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ جس طرح انسانی قلب میں نمودار ہوتے ہیں' اسی طرح حواس کے سامنے بھی نمودار ہوتے ہیں۔ اسی وقت ان احساسات کو سکون و قرار نصیب ہوتا ہے اور فکری احساسات کا دباؤ پوری طرح ختم ہوتا ہے' کیونکہ انھیں ظاہر و باطن کے مابین مکمل ہم آہنگی

محسوس ہوتی ہے اور وہ مخفی اسرار اور نامعلوم اشیا کی طرف اپنے میلان اور ظاہری امور اور اشکال کی طرف اپنے رجحان، دونوں کی تسکین کا سامان پا لیتے ہیں۔

اسی فطری بنیاد پر اسلام نے اپنی سب عبادات کو قائم کیا ہے۔ یہ عبادات صرف نیت یا مجرد روحانی توجہ سے ادا نہیں ہوتیں بلکہ اس وقت ادا ہوتی ہیں جب کہ یہ توجہ ایک متعین ظاہری شکل اختیار کر لے۔ مثلاً نماز میں قبلے کی طرف رخ کرنا، تکبیر کہنا اور قرات اور رکوع اور سجدہ کرنا ہے۔ حج میں ایک متعین مقام سے احرام باندھنا، مقررہ لباس پہننا، خاص طرح کی حرکات، سعی، دعا، تلبیہ، قربانی اور حلق و قصر ہے۔ روزے میں نیت کے ساتھ کھانے پینے اور مباشرت سے اجتناب کرنا ہے۔ اس طرح ہر عبادت میں مخصوص حرکات ہیں، اور ہر حرکت میں عبادت ہے۔ یہ اسی لیے کہ انسان کے ظاہر و باطن میں امتزاج ہو جائے، انسان کی سب طاقتیں منظم اور مرتب ہو جائیں اور وہ سب مل کر فطرت کی پکار پر اس طرح لبیک کہیں جو اس کے مخصوص تصور کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ مخفی طاقتوں کے لیے ظاہری شکلیں اختیار کرنے کی فطری رغبت ہی نے کج فطرت افراد کو راہ راست سے بھٹکایا ہے۔ چنانچہ ایک گروہ نے سب سے بڑی طاقت ----- خدا ----- کے لیے رمز کے طور پر پتھروں، درختوں، ستاروں، سورج، چاند، جانوروں، پرندوں اور مختلف اشیا کی محسوس اور مجسم علامتیں اختیار کیں۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ مخفی قوتوں کے اظہار کے لیے کوئی مناسب طریقہ نہ پا سکے۔ اسلام نے آکر عبادات کی ان معین شکلوں کی صورت میں فطرت کے ان داعیات کی تکمیل کی، مگر ذات الوہیت کو ہر محسوس تصور اور ہر سمت اور جہت سے بالاتر رکھا۔ چنانچہ جب کوئی شخص اپنے دل، اپنے حواس اور اپنے اعضا و جوارح سے بالکلیہ خدا کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے تو وہ قبلے کی طرف رخ کرتا ہے۔ اس طرح اللہ کی طرف رخ کرنے میں، جو کسی مقام سے وابستہ نہیں ہے اور قبلے کی طرف رخ کرنے میں، جو ایک مقام پر ہے، انسان کی سب قوتوں کے مابین وحدت و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

غیر اقوام سے تشبہ کی ممانعت

یہ امر ناگزیر تھا کہ مسلمان جس گھر کی طرف نماز اور عبادات میں رخ کریں، وہ مخصوص اور ممتاز ہو، تاکہ امت مسلمہ، طریق زندگی اور سمت سفر، ہر شے میں ممتاز ہو۔ قبلے کا یہ امتیاز امت کے ممتاز و منفرد ہونے کے شعور کا فطری نتیجہ بھی ہے اور اپنے اثرات کے لحاظ سے امت کے ممتاز اور منفرد ہونے کا شعور بھی پیدا کرتا ہے۔

اسی وجہ سے غیر مسلمین سے ان کی خصوصیات میں ----- جو ان کے باطنی احساسات کی ظاہری تعبیر ہوتی ہیں ----- تشبہ اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی جس طرح کہ فکر و عمل میں ان کے طریقے کی پیروی

سے روکا گیا ہے۔ یہ تعصب کی بات نہیں ہے، یہ ظاہر پرستی و اشکال پرستی بھی نہیں ہے۔ اشکال کے پس پردہ جو امور ہوتے ہیں، یہ ان پر گہری نظر ہے، ظاہری شکلوں کے پیچھے مخفی محرکات پر نظر۔ یہ مخفی محرکات ہی ہیں جو ایک قوم کو دوسری قوم سے، ایک نظریے کو دوسرے نظریے سے، ایک فکر کو دوسری فکر سے، ایک ضمیر کو دوسرے ضمیر سے، ایک کردار کو دوسرے کردار سے، مختصرا" یہ کہ پوری زندگی کے رخ کو دوسرے رخ سے ممتاز کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہودی اور عیسائی (داڑھی کے بال وغیرہ) نہیں رنگتے تو تم ان کے خلاف کرو" (مالک، بخاری، مسلم، ابوداود)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ کے پاس تشریف لائے تو وہ آپؐ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: "(تعظیم کے لیے) کھڑے نہ ہوا کرو جیسے کہ عجمی ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں" (ابوداود، ابن ماجہ)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح کہ عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھا دیا۔ میں تو صرف بندہ ہوں، تو مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو" (بخاری)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ظاہری شکل یا لباس، ایک حرکت یا روش اور ایک قول یا ادب کے بارے میں تشبہ سے منع فرمایا کیونکہ ان سب کے پیچھے ایک باطنی شعور ہے۔ جو ایک تصور حیات کو دوسرے تصور حیات سے، ایک طریق زندگی کو دوسرے طریق زندگی سے اور ایک گروہ کی علامات و صفات کو دوسرے گروہ کی علامات و صفات سے ممتاز کرتا ہے۔

امت مسلمہ : دنیا کی قائد

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کے خاص طریق زندگی کے سوا ---- جسے زمین میں قائم و برپا کرنے کے لیے یہ امت آئی ہے ---- کہیں اور سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ آپؐ نے دراصل روے زمین کی دوسری قوموں سے اندرونی طور پر شکست کھانے اور ان کی ذہنی غلامی سے روکا ہے۔ کسی سماج سے ذہنی طور پر شکست کھانے ہی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان اس سماج کی تقلید اور نقالی کرنے لگتا ہے۔ لیکن امت مسلمہ کا یہ کام نہیں ہے۔ اس کا قیام تو اس لیے ہوا ہے کہ وہ نوع انسانی کی قیادت کے مقام بلند پر فائز ہو۔ اس کے شایان شان یہی ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی طرح اپنی روایات و اعمال بھی اسی سرچشمے سے حاصل کرے جس نے اسے نوع انسان کی قیادت و رہنمائی کے لیے چنا ہے۔ امت مسلمہ تو سب سے بلند و برتر ہے، وہ امت وسط ہے، وہ خیر امت ہے، جو انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے برپا کی گئی ہے۔ یہ امت اپنی فکر اور اپنا طریق زندگی کہاں سے اخذ کرے گی؟ یہ اپنی روایات اور اپنے ضوابط و قوانین کہاں سے حاصل کرے گی؟ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ سے حاصل نہ کرے گی

تو ان پست افراد و اقوام سے حاصل کرے گی جنھیں پستیوں سے نکال کر بلندیوں تک لے جانے کے لیے یہ امت وجود میں آئی ہے۔

اسلام نوع انسانی کو بلند ترین فکر اور سب سے صحیح اور محکم طریق زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ وہ پوری نوع انسانی کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے سایہ رحمت میں آ جائے۔ یہ کوئی تعصب کی بات نہیں ہے کہ اسلام نوع انسانی کا اتحاد کسی اور بنیاد کے بجائے صرف اپنی بنیاد پر' کسی اور نظام زندگی کے بجائے صرف اپنے نظام حیات کی اساس پر اور کسی اور جھنڈے کے بجائے صرف اپنے پرچم کے تحت کرنا چاہتا ہے۔

جو شخص تمھیں اللہ اور بلند ترین فکر اور بہترین نظام زندگی کی بنیاد پر اتحاد کی دعوت دیتا ہے اور اس بات سے انکار کرتا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے طریق زندگی سے انحراف اور جاہلیت کی مہلک پستیوں میں گرنے کی بنیاد پر اتحاد حاصل کیا جائے' وہ متعصب نہیں ہے۔ وہ متعصب ہے صرف حق اور خیر و صلاح کے لیے۔

امت مسلمہ' جو ایک مخصوص اور ممتاز قبیلے کی طرف رخ کرتی ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مفہوم کو جان لے۔ قبلہ صرف ایک مقام یا سمت کا نام نہیں ہے جس کی طرف کوئی گروہ نماز میں رخ کرتا ہو۔ مقام یا سمت تو محض ایک رمز ہے' امتیاز اور خصوصیت کا رمز۔ امتیاز فکر میں' امتیاز تشخص میں' امتیاز منزل مقصود اور ہدف میں' امتیاز ان امور میں جن کا اہتمام کیا جائے' امتیاز وجود میں۔

آج جاہلیت کے مختلف تصورات سے زمین گونج رہی ہے۔ جاہلیت کے مختلف اغراض و مقاصد ہیں جنھیں سب اہل زمین اپنائے ہوئے ہیں۔ جاہلیت کے مختلف جھنڈے ہیں جنھیں سب قومیں اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور امت مسلمہ جاہلیت کے اس طوفان کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ آج امت مسلمہ کو اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا مخصوص تشخص ہو' جو غالب جاہلیت کے تصورات سے بالکلیہ ممتاز و مختلف ہو۔ اس کے اپنے مخصوص مقاصد اور اعمال ہوں جو اس تشخص اور اس تصور کے ساتھ میل کھاتے ہوں' اور اس کا اپنا مخصوص پرچم ہو جو خدائے واحد کے نام پر بلند ہو۔ اور یہ اس لیے کہ دنیا پر واضح ہو سکے کہ وہ امت وسط ہے جو سب انسانوں کے لیے برپا کی گئی ہے تاکہ وہ عقیدے کی امانت اور اس کی میراث کی حامل بن سکے۔

یہ عقیدہ زندگی کا کامل نظام ہے۔ یہ نظام ہی وہ شے ہے جس کے باعث خلافت کی حامل امت ----- جو عقیدے کی میراث کی وارث' انسانوں پر حق کی گواہ و نگراں اور اس بات کی ذمہ دار ہے کہ پوری نوع انسانی کو اللہ کی اطاعت و بندگی کی طرف لائے ----- دوسری قوموں سے ممتاز ہوتی ہے۔ امت مسلمہ کی زندگی میں اس نظام کا عملی ظہور ہی وہ چیز ہے جو اس امت کو تشخص اور وجود میں' اغراض و مقاصد اور مہتم بالشان امور میں اور پرچم اور علامتوں میں امتیاز عطا کرتا ہے۔ یہی چیز اسے قیادت کا وہ مقام بخشتی ہے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے اور جس کی غرض سے وہ انسانوں کے لیے برپا کی گئی ہے۔ اس نظام کے بغیر وہ تباہ و برباد ہے اور اس کے نشانات مبہم اور علامات نامعلوم ہیں' خواہ وہ کتنے ہی لبادے اوڑھے اور کتنے ہی نعرے' دعوتیں اور جھنڈے بلند کرے (فی ظلال القرآن' جلد اول)۔

کردار سازی اور اصلاح معاشرہ

تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی ○

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد انسانوں کی ہدایت و رہنمائی تھا۔ چونکہ آپؐ کی رسالت اور آپؐ کا پیام قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہے' اس لیے آپؐ نے تعلیم و تربیت کے لیے ایسا طریق کار اختیار فرمایا جو تعمیر شخصیت اور کردار سازی کے لیے ہر دور میں ضروری ہے۔

معاشرے کی تعمیر و تشکیل' فرد کی اصلاح و تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے کی اصلاح کا کام افراد کی بہتر تعلیم و تربیت کے ذریعے انجام دیا۔ آپؐ کے نظم تربیت اور کردار سازی کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپؐ کی تین حیثیتوں معلم' داعی اور مربی کو ملحوظ رکھا جائے۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ان تینوں حیثیتوں میں درجہ کمال حاصل تھا۔

معلم اعظم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے منہج تربیت کا غور سے مطالعہ کریں تو تین عناصر بہت نمایاں نظر آتے ہیں یعنی ایمان باللہ' اخلاق حسنہ اور عمل صالح کی تلقین۔ ان میں سرفہرست ذہنی اور فکری اصلاح کا عنصر ہے۔ آپؐ نے فکر اور قلب و دماغ کی اصلاح کا کام عقیدے کی تعلیم و تربیت سے فرمایا۔ اس لیے کہ افکار و تصورات' انسانی رویوں اور اخلاقی اقدار کا دار و مدار' عقائد کی صحیح تعلیم و تربیت پر موقوف ہے۔

ایمان باللّٰہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت' تعلیم اور تربیت تینوں کا آغاز توحید کی تعلیم سے فرمایا: یایھا الناس! قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا ' "اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور خدا نہیں ہے' اسی میں تمھاری کامیابی ہے" (مسند احمد بن حنبل' ج ۵' ص ۳۷۱)۔

○ پروفیسر' شعبہ علوم اسلامیہ' اسلامیہ یونی ورسٹی' بہاولپور

مکتب رسالتؐ کا پہلا درس، پہلی دعوت اور تربیت کا پہلا قدم توحید کا سبق تھا جسے آپؐ نے لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ فرمایا۔ انسانی فکر کو شرک، بت پرستی اور توہم پرستی سے آزاد کرا کے صرف ذات وحدہ لاشریک سے وابستہ کیا۔ عبد و معبود کے درمیان ایک لازوال رشتہ قائم فرمایا کہ بندہ اپنے خالق حقیقی کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھیرائے، نہ ذات میں، نہ ان صفات میں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں اور نہ ہی اس ذات کے لیے مخصوص حقوق میں۔ ان تینوں میں سے کسی ایک میں بھی شرک، ظلم عظیم ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○ (لقمان ۳۱: ۱۳) "یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔ قرآن کریم نے شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء ۴: ۴۸)، "اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے"۔

توحید، رسالتؐ اور آخرت، یہ وہ تین بنیادی عقائد ہیں جنھیں تسلیم کر لینے سے انسان کی زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں اس کا نقطہ نگاہ یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ انھی عقائد کی تعلیم سے عبدیت کا شعور اجاگر ہوتا ہے۔ منصب خلافت و امامت کا آغاز بھی ایمان کے انھی تقاضوں کو پورا کرنے پر ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق کثرت سے احکام و اصول بیان ہوئے ہیں۔ بیان احکام کے اسلوب پر غور کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ جملہ احکام پر عمل کی اصل قوت کا سرچشمہ ایمان ہے۔ اسی لیے قرآن کریم جب عبادات و معاملات سے متعلق احکام کو بیان کرتا ہے تو بار بار عقیدہ اور ایمان کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرہ میں تحویل قبلہ کے حکم کے ساتھ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدوْر ہے۔ وہ سینوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کا اظہار، کہ اسے ہر چیز پر ہر وقت قدرت حاصل ہے (البقرہ ۲: ۱۴۸)۔ جہاد کا ذکر آیا تو غزوۂ بدر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل ایمان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا کرنا چاہیے (ال عمرٰن ۳: ۱۲۲)۔ سورۃ النساء میں معاشرتی زندگی کے متعلق احکام کا بیان ہے۔ ایک جگہ خواتین، ازواج، یتیموں اور وصیت وغیرہ کے احکام بیان کر کے عقیدے کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ: "جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کارساز ہے۔ وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے اور تمھاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے۔ جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کی جزا کا طالب ہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں جہاں کا اجر ہے، اور اللہ تعالیٰ سنتا اور دیکھتا ہے" (النساء ۴: ۱۳۲-۱۳۴)۔ قرآن کریم کا ہر جگہ یہی انداز ہے کہ احکام کے بیان کے ساتھ عقیدے کا حوالہ ضرور دیا گیا

ہے۔ گویا احکام پر عمل درآمد کے لیے عقیدہ بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

عقائد پر ایمان کا حقیقی مرکز قلب ہے۔ اسی لیے قلب کے تزکیے اور تربیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں کہ: "انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ تندرست اور صحیح ہو تو سارا جسم تندرست رہتا ہے' اور جب وہ بگڑ جائے تو جسم کا سارا نظام بگڑ جاتا ہے' غور سے سن لو کہ گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے" (بخاری ' الجامع الصحیح' نور محمد اصح المطابع' کراچی ۱۹۶۱' ج ۱' ص ۱۳)۔

قلب کی اس مرکزی حیثیت ہی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت و اصلاح قلب کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ اسی لیے قرآن حکیم نے تزکیہ نفس کو منصب نبوت کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے۔

لفظ "تزکیہ" میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں۔ ایک' پاک و صاف کرنا اور دوسرے' نشوونما دینا۔ تزکیہ قلب کے پہلے مرحلے میں' قلب و دماغ کو ہر قسم کے برے عناصر سے پاک و صاف کرنا ضروری ہے۔ مثلاً غلط تصورات' توہم پرستی' حسد' کینہ' بغض' تکبر' شر و فتنہ اور کفر کی تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کرنا وغیرہ۔ قرآن حکیم میں اس کے لیے "تطہیر" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (التوبہ ۹: ۱۰۳)' "ان کے اموال میں آپؐ صدقات وصول کیجیے اور اس کے ذریعے انھیں پاک و صاف کیجیے"۔

دوسرے مرحلے میں' ایمان و یقین' عزم و استقامت' اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اخلاص و محبت پیدا کرنا ہے۔ انھی اوصاف سے قلب کا نشوونما شروع ہوتا ہے۔ ان اوصاف کی تکمیل کے ساتھ مرد مومن تیسرے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے جو "مقام احسان" کہلاتا ہے۔ یہ وہ بلند تر مقام ہے جہاں سے عبدیت و انسانیت میں درجہ کمال کا آغاز ہوتا ہے۔

تزکیہ نفس سے قلب انسانی میں طاقت ور ضمیر اور معاصی و منکرات کے خلاف بھرپور قوت مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے نیتوں کی اصلاح ہوتی ہے اور قلب مومن نور الٰہی سے منور ہو جاتا ہے۔

معصیت اور منکر کے ارتکاب سے قلب پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے: "مومن جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے سبب اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے اور اس گناہ سے باز آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو قلب سے وہ داغ مٹ جاتا ہے اور دل صاف شفاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر گناہوں میں اضافہ ہوتا رہے تو نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ گناہوں کی سیاہی سارے قلب پر پھیل جاتی ہے"۔ اسی کو (قرآن کریم) "زین" کہتا ہے' اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے: "ہرگز نہیں' بلکہ ان کے دلوں

پر اپنے کرتوتوں کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے" (ابن ماجہ' السنن' مکتبہ احیا السنتہ النبویہ' سرگودھا' ۱۳۹۴ھ' ص ۳۲۳)۔ اس حدیث مبارک سے جرائم کی تاثیر بتائی گئی ہے کہ اگر انسان مسلسل برائی کا ارتکاب کرتا رہے تو اس کی بدبختی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جرم و معصیت کا احساس کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جاتا ہے' دل مسخ ہو جاتا ہے اور زنگ آلود ہو کر اس درجے کو پہنچ جاتا ہے کہ جہاں سے واپسی مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتی ہے۔ اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح تعبیر کیا ہے: خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (البقرہ ۲:۷) "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب تربیت ایسا تھا کہ عقیدہ و ایمان کی تعلیم کے ذریعے قلوب سے سیاہ داغ اور زنگ کے آثار کھرچ کھرچ کر صاف کر دیے جائیں اور ایمان کی حرارت پیدا کر کے قلوب کو ایسی زندگی عطا کی جائے جو انسان کو مسلسل ملکیت اور روحانیت کی طرف گامزن رکھے۔ عقیدے سے پیدا ہونے والی یہی قوت انسان کو عمل صالح پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کے اندر نفس امارہ مرجھا کر نفس لوامہ کی صورت میں نئی زندگی پاتا ہے اور پھر ایمان و عمل صالح کے ذریعے نفس مطمئنہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب قلب انسانی کی چشمہ ایمان سے آبیاری ہوتی ہے تو قلبی ایمان سراسر عمل کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ اس طرح ایمان اور عمل میں مکمل طور پر ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اخلاق حسنہ: کردار سازی میں دوسرا بنیادی عنصر فضائل اخلاق ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اخلاق حسنہ ایمان ہی کا حصہ ہیں جنھیں ایمان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ سے بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو حسن خلق کو ایمان کا جز قرار دیتی ہیں۔ ایمان کے لازمی اثرات انسان کی ظاہری زندگی پر بھی ہوتے ہیں اور باطنی زندگی پر بھی۔ باطنی زندگی پر ایمان کے اثرات تزکیہ قلب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور ظاہری زندگی پر مکارم اخلاق کی صورت میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں تربیت اخلاق بھی ایک فریضہ تھا۔ آپ کا ارشاد ہے: "میں تو بھیجا ہی اس لیے گیا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں"۔ ایمان و اخلاق کا باہمی تعلق ان احادیث سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے: "جس شخص میں امانت داری نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں' اور جو عہد کی پاس داری نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں" (مسند امام احمد بن حنبل' ج ۳' ص ۱۳۰-۱۵۴)۔ اسی طرح "وہ شخص تو مومن نہیں جو خود تو شکم سیر ہو کر کھائے اور اس کا قریبی پڑوسی بھوکا رہے" (مشکوٰۃ)۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ شخص مومن نہیں' قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ شخص مومن نہیں' قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ شخص تو مومن نہیں"۔ صحابہ کرامؓ نے پریشان ہو کر پوچھا: یارسول اللہ! یہ بدنصیب کون ہے جس کے لیے آپ قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ وہ مومن نہیں ہے۔ جواب میں آپ نے فرمایا: "یہ وہ شخص ہے جس کی ایذا رسانیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں" (بخاری' ج ۲' ص ۸۸۹)۔ اس قسم کی بہت سی احادیث سے

پتا چلتا ہے کہ ایمان اور اخلاق حسنہ لازم و ملزوم ہیں۔

پانچ بنیادی اخلاقی اصول:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اخلاقیات کی تعلیم و تربیت کے ساتھ اخلاقی اصول و ضوابط کا ایک جامع نظام بھی عطا فرمایا۔ یہاں ان چند اخلاقی اصولوں کو بیان کیا جا رہا ہے جن پر اخلاقی نظام کا مدار ہے۔ کچھ اخلاقی اصول ایسے ہیں کہ جب ان پر عمل کیا جائے تو دیگر اخلاقی فضائل خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں پانچ اخلاقی اصول وہ ہیں جو "عبادات خمسہ قلبیہ" کہلاتے ہیں۔

۱۔ **اخلاص**: اخلاص ان اصولوں میں سرفہرست ہے جو انسانی فکر و نظر کی اصلاح کرتے ہیں۔ نیت کو درست کر کے قلب و دماغ میں پاکیزہ، مثبت اور تعمیری خیالات و تصورات کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کے ذریعے ایک طرف تعلق مع اللہ صحیح بنیادوں پر قائم ہوتا ہے تو دوسری طرف انسانوں کے باہمی تعلقات بھی ہر قسم کی آلودگی، غرض اور نمود و ریا سے پاک و صاف ہوتے ہیں۔

۲۔ **تقویٰ**: "عبادات خمسہ قلبیہ" میں دوسرا اصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ ایک باطنی کیفیت کا نام ہے جو قلب مومن میں اللہ تعالیٰ کی شدید محبت اور دل و دماغ میں اس کی عظمت و کبریائی کے شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ خوف کی اس کیفیت کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ غلبہ شوق و محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اور جس کی وجہ سے قلب مومن میں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا عمل صادر نہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بن جائے۔ قرآن حکیم تقویٰ کی صفت کو زندگی کا بہترین زاد راہ قرار دیتا ہے۔ فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرہ ۲: ۱۹۷)۔

۳۔ **شکر**: تیسرا اصول شکر ہے۔ یہ بھی "عبادات خمسہ قلبیہ" میں سے ایک اہم عبادت ہے۔ شکر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ مومن کو دل کی گہرائی سے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا احساس ہو جو اسے قدم قدم پر حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتیں بہت کثرت کے ساتھ ہر فرد کو حاصل ہیں، اور اس طرح حاصل ہیں کہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط (ابرٰھیم ۱۴: ۳۴) "اگر تم اللہ تعالیٰ کی صرف ایک نعمت (کے فوائد و منافع) کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے"۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی صحیح عظمت اور حصول نعمت کے شعور سے جو امتنان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی شکر کہلاتی ہے۔ یہ احساس شکر ہی ہے کہ اہل ایمان بے اختیار اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اپنے اس عمل میں فرحت و مسرت کی خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ میں جذبہ شکر کو خوب اچھی طرح اجاگر فرمایا تھا اور ان کی تربیت اس طرح فرمائی کہ وہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن گئے تھے تو دوسری طرف انسانوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ تشکرانہ تھا۔ آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ: "جو انسانوں کا

شکرگزار نہیں' وہ اللہ کا بھی شکرگزار نہیں ہو سکتا" (مسند امام احمد بن حنبل ' دارالفکر' قاہرہ' ج ۲' ص ۲۵۸)۔

۴۔ صبر: چوتھا اصول صبر ہے۔ یہ صفت بہت سے کریمانہ اخلاق کی اساس ہے۔ صبر وہ باطنی قوت ہے جو انسان میں تحمل و بردباری' ضبط نفس اور ثابت قدمی پیدا کرتی ہے۔ امام غزالیؒ نے صبر کے مفہوم پر بہت لطیف بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک صبر کبھی نفسانی خواہشات کے خلاف ڈٹ جانے اور ان کا مقابلہ کرنے کا نام ہے اور کبھی مصائب کے مقابلے میں قوت برداشت کا نام ہے۔ کبھی دولت مندی اور خوش حالی کی صورت میں اس کا اظہار بردباری' تحمل اور ضبط نفس کی صورت میں ہوتا ہے۔

۵۔ توکل: پانچواں اصول توکل ہے۔ قلبی عبادات میں اس صفت کا بہت بنیادی کردار ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ توکل پر عمل کرنا آسان نہیں' یہ اللہ تعالیٰ کے بہت مقرب بندوں کی صفت ہے۔ یہ صفت اس لیے مشکل ہے کہ اس کائنات کے امور میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے عمل دخل کو مانیں تو یہ توحید کے خلاف ہے' اور اگر تمام اسباب کو ختم کر دیں تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا ظاہری اسباب پر یا کسی ایک سبب پر بھی توکل نہ کر بیٹھے بلکہ ان تمام اسباب کے پیچھے جو مسبب الاسباب ہستی ہے صرف اس پر نظر رہنی چاہیے اور اسی ہستی پر توکل کرنا چاہیے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اعلیٰ مقاصد کے لیے بھرپور جدوجہد کریں اور پھر اس کے نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط (الطلاق ۶۵: ۳)' "جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے"۔

دیگر چار اخلاقی اصول وہ ہیں جو انسان کے ظاہر کی اصلاح کر کے تمام معاملات میں حسن و نکھار پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں جو باطن کی بھی اصلاح کرتی ہیں اور ظاہر کی بھی۔

صدق: صدق کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فکر اور ارادے اور قول و فعل میں سچا ہو۔ اس کے عقیدے اور عمل میں کوئی تضاد نہ ہو۔ امام غزالیؒ نے صدق کی چھ قسمیں بیان کی ہیں: ۱۔ نیت و ارادے میں صداقت ۲۔ قول میں صداقت ۳۔ عزم میں صداقت ۴۔ عزم کو پورا کرنے میں صداقت ۵۔ عمل میں صداقت اور ۶۔ دین داری کے مقامات میں صداقت۔

امانت: یہ اخلاقی صفت انسانوں کے درمیان باہمی معاملات میں بہت اہم اور بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ باہمی لین دین' عہد و پیمان اور فرائض و ذمہ داری میں مکمل طور پر دیانت داری اور امانت داری کا ثبوت دیں۔ امانت کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں وہ تمام عہد و پیمان شامل ہیں جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ اسی طرح وہ عہد و پیمان اور معاہدات بھی شامل ہیں جو انسانوں میں باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے دین و شریعت بھی امانت ہے اور بقول امام

ابن تیمیہ" ' تمام انتظامی' سیاسی اور معاشرتی عہدے اور ملازمتیں بھی امانت میں داخل ہیں۔ لہٰذا وہ تمام فرائض و ذمہ داریاں جو ان عہدوں کو قبول کرنے سے عائد ہوتی ہیں' سب امانت ہیں۔ امانت ہی وہ اخلاقی قدر ہے جو اہل ایمان میں وہ شعور اور احساس پیدا کرتی ہے جس کی بنا پر انسان اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صدق و امانت کا مظاہرہ حقوق اللہ میں بھی نظر آتا ہے اور حقوق العباد میں بھی۔ مکہ مکرمہ میں قبل از نبوت جب آپ ؐ نے تجارت میں حصہ لینا شروع کیا تو اہل مکہ نے ان دو نمایاں صفات کی بنا پر آپ ؐ کو "الصادق" اور "الامین" کے القاب سے نوازا۔ آپ ؐ کی عملی تعلیم بھی یہی تھی کہ اجتماعی زندگی میں صدق و امانت کا غلبہ ہونا چاہیے۔

ایثار: یہ بھی صدق و امانت کی طرح جامع الصفات ہے۔ ہمدردی اور سخاوت مل کر جب اعلیٰ درجے کو پہنچ جائیں تو ایثار کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ یہ قربانی کا وہ جذبہ ہے جو انسان دوسروں کی خاطر پیش کرتا ہے اور اس میں فرحت و خوشی محسوس کرتا ہے۔ قرآن کریم نے انصار کی تعریف کرتے ہوئے ان کی صفت ایثار کو اس طرح بیان فرمایا ہے: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط قف (الحشر ۵۹:۹)' "یہ لوگ اپنے اوپر (اپنے مہاجرین بھائیوں) کو مقدم رکھتے ہیں' خواہ خود تنگی میں ہی کیوں نہ ہوں"۔

تواضع: یہ وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت اور اپنی معرفت یا معرفت نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی عظیم الشان قدرت و جلال کا علم ہوتا ہے تو دوسری طرف اپنی کمزوریوں' کوتاہیوں' خامیوں اور نقائص کا۔ اس کے نتیجے میں انسان انتہائی عاجزی و انکساری کے ساتھ اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے' ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی' رحم دلی اور نیاز مندی کے ساتھ پیش آتا ہے۔

تواضع کی صفت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تکبر و غرور کے تمام مظاہر سے اپنے آپ کو پاک صاف کر لیا جائے۔ تکبر نام ہے حق کو ٹھکرانے اور لوگوں کو حقیر جاننے کا جب کہ تواضع نام ہے حق کو قبول کرنے اور لوگوں کے ساتھ انکساری اور رحم دلی کے ساتھ پیش آنے کا۔ اسی چیز کا حکم قرآن حکیم میں دیا گیا ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الحجر ۱۵: ۸۸)' "اور اپنا بازو اہل ایمان کے لیے جھکا دو"۔ تواضع اللہ تعالیٰ کے مقرب اور خاص بندوں کی صفت ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یاعائشہ! تواضعی فان اللہ عزوجل یحب المتواضعین ' "اے عائشہ ؓ ! تواضع اختیار کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تواضع کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" (کنز العمال ' ج ۳' ص ۱۱۳)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان اخلاقی اقدار کا بہترین نمونہ تھی۔ یہی اوصاف آپؐ نے صحابہ کرامؓ میں پیدا فرمائے، اور یہی وہ اخلاقی اقدار ہیں جن کے بغیر ایک مہذب اور صالح معاشرے کا قیام ممکن نہیں۔

عمل صالح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظم کردار سازی میں تیسرا بنیادی عنصر عمل صالح ہے۔ آپؐ نے خود اپنی زندگی کو وحی الٰہی کے مطابق سراپا عمل میں ڈھال کر لوگوں کے لیے بہترین عمل کا نمونہ پیش فرمایا اور ساتھ ہی صحابہ کرامؓ کی انفرادی اور اجتماعی طور پر تربیت فرما کر انھیں عمل صالح کی شاہراہ پر گامزن فرمایا۔

شریعت نے عمل صالح کے معاملے میں انسان کو تاریکی میں نہیں چھوڑا کہ وہ خود اپنی عقل و حواس سے فیصلہ کرے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ عمل صالح کیا ہے تاکہ اسے اختیار کرے، اور عمل فاسد کیا ہے کہ اس سے اجتناب کرے۔ قرآن و سنت میں خیر و شر، صلاح و فساد، سعادت و شقاوت اور معروف و منکر کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے اصول و قواعد کا تعین بھی کیا گیا ہے اور ہر شعبہ زندگی میں نہ صرف عمل صالح کی وضاحت کر دی گئی ہے بلکہ اس کی عملی تشکیل کی جھلک بھی اسوہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں دکھا دی ہے۔

پہلے جن دو عناصر یعنی عقائد اور اخلاق حسنہ کی تعلیم و تربیت کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی صحیح تعلیم سے اعمال صالحہ کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے، اور شر کی صلاحیت کم ہو جانے کی وجہ سے اعمال فاسدہ کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظم تربیت میں اس بات کا بہت اہتمام ہوتا تھا کہ اعمال، اخلاق اور عقائد و افکار سے فساد کو ممکنہ حد تک ختم کر دیا جائے۔ اسی لیے آپؐ اعمال و احکام کے ساتھ بار بار توحید و آخرت کا ذکر فرماتے اور فضائل اخلاق کی نصیحت فرماتے تھے۔ عقیدہ و فکر کی اصلاح اور اخلاقی تربیت سے جس قسم کے اعمال کا داعیہ قلب مومن میں پیدا ہو گا وہ عقائد اور اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ ہوں گے۔ ایسے ہی اعمال کو اعمال صالحہ کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں بہت کثرت کے ساتھ عمل صالح کا ذکر کیا گیا ہے اور صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی عمل قبول ہو گا جو صالح ہو گا۔ قرآن کریم کے اسلوب بیان کا غور سے مطالعہ کریں تو یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ قبول ایمان کے بعد عمل صالح ہی مطلوب ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا اظہار عمل بالجوارح سے ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے ایمان اور عمل صالح کو قرآن حکیم نے ایک ساتھ انہتر(۶۹) جگہ ذکر کیا ہے۔ ان میں صیغہ واحد کے ساتھ سولہ جگہ آیا ہے مثلاً مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (المائدہ ۵:۶۹) ”جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور

نیک عمل کرے گا بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا"۔ جمع کے صیغے کے ساتھ عام طور پر "آمنوا وعملوا الصلحت" کی ترکیب میں ترپین (۵۳) آیات میں ایمان و عمل صالح ایک ساتھ مذکور ہے۔ مثلاً وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط (البقرہ ۲:۲۵)، "اے رسولؐ! آپؐ بشارت دیجیے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح اختیار کیا کہ ان کے لیے یقیناً باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی"۔

قرآن حکیم نے بار بار اس ترکیب کو دہرایا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ایک لازمی عنصر ہے۔ قبول ایمان کے ساتھ ہی عملی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ عمل کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بہت اہم ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نہ تمھاری صورتوں کو دیکھتا ہے نہ تمھارے نسبوں کو دیکھتا ہے، وہ تو تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے" (مسلم، ج ۲، ص ۳۲۵)۔ گویا اصل بنیاد عمل ہے اسی پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔

فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے عمل صالح بہت ضروری ہے۔ اچھے اعمال کے بغیر اچھے معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے لیے صالح تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے جب کہ تعلیم و تربیت کا ہر فرد محتاج ہے۔ اگر لوگوں میں خیر کا جذبہ بیدار نہ کیا جائے اور شر و فساد کی برائی دل و دماغ میں نہ بٹھائی جائے اور تعلیم و تربیت کے وہ طریقے نہ اپنائے جائیں جو اصلاح و تربیت کے لیے ضروری ہیں تو برائی اور فساد کے پھیلنے کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت میں بھی ہمیں اسوۂ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے رہنمائی ملتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تربیتی نظام میں لوگوں کی نفسیات اور ان کی صلاحیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ تربیت کے سلسلے میں آپؐ کی بعض ہدایات تمام انسانوں کے لیے یکساں اہم اور مفید ہیں۔ ان میں سے ایک بنیادی ہدایت دعا کی تلقین ہے۔ اعمال صالحہ کی توفیق کے لیے رسولؐ اللہ نے خود بھی دعا کی اور امت کو بھی دعا کی تعلیم دی۔ ایک ماثور دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں بنیادی عناصر کو جمع فرمایا۔ اس میں ایمان کا اظہار بھی ہے کہ دعا کی صورت میں بندۂ مومن اپنے رب پر یقین و ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ آپؐ یہ دعا کثرت سے فرمایا کرتے تھے:

اللھم اھدنی لاحسن الاعمال لا یھدی لاحسنھا الا انت واعوذ بک من منکرات الاخلاق والاعمال والاھوا (النسائی السنن، المکتبہ السلفیہ، لاہور ۱۹۵۶، ج ۱، ص ۱۰۶)، "اے اللہ! مجھے بہترین اعمال کی طرف رہنمائی فرما، اور صرف تو ہی اچھے اعمال کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور اے اللہ! میں برے اخلاق، برے اعمال اور نفسانی خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

دعا کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ اس کے ذریعے نیت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور منزل کا تعین بھی۔ صرف سفر کا آغاز باقی رہتا ہے۔ نیت درست ہو جائے اور منزل کا تعین بھی ہو اور انسان منزل کی جانب قدم بڑھانا شروع کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے نشان ہائے منزل بھی واضح کر دیتا ہے۔ رہا مسئلہ لوگوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا' تو یہ ذمہ داری ہے والدین کی' اساتذہ کی' اہل علم و دانش کی' قائدین اور ارباب حل و عقد کی وہ اپنا اپنا کردار ادا کریں۔ ایمان' اخلاق اور اعمال صالحہ تین بنیادی ستون ہیں۔ تعلیم و تربیت میں تینوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔ کردار سازی کے لیے یہی جامع نظام ہے اور یہی مکتب رسالتؐ کا نظم تربیت رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان تینوں عناصر کو اپنے اندر اور اپنے معاشرے میں پیدا کر سکیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے فقہی اصول

مولانا گوھر رحمٰن

دین اسلام واحد ہے اور امت مسلمہ امت واحدہ ہے۔ فقہاے اسلام و ائمہ مجتہدین کی حیثیت معلمین دین اور راہنمایان دین کی ہے جنھوں نے مسائل و نوازل (نو پیش آمدہ امور) کے احکام کے فہم و تفہیم کے لیے بحث و تحقیق اور اجتہاد و استنباط کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں' جن کی بنا پر پوری امت ان کی ممنون ہے اور اللہ کے ہاں ان کے لیے ان شاء اللہ اجر غیر ممنون ہے۔ ان کی علمی و فقہی تحقیقات کی حیثیت مستقل مذاہب کی نہیں بلکہ قرآن و سنت کی تعبیرات و تشریحات کی ہے۔ ان کا فقہی اختلاف امت کی وحدت کے منافی نہیں ہے بلکہ شریعت کے محاسن میں شامل ہے' جیسا کہ قاضی ابن العربیؒ نے فرمایا ہے: "ائمہ کا فروعی اختلاف شریعت کی خوبیوں میں شامل ہے" (احکام القرآن لابن العربی' ج ۱' ص ۳۸۲)۔

اس حقیقت کے پیش نظر مجتہدین کی اجتہادی آرا کو متوازی مذاہب کے طور پر پیش کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ ان کے اختلاف کو اختلاف تعبیر اور اختلاف تنوع کی حیثیت دینی چاہیے اور ان کی آرا متنوعہ کو فرقہ بندی اور عصبیت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ تمام فقہاے اسلام اور ائمہ مجتہدین ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں اور ان کے مناقب و مباحث کا تذکرہ موجب برکت و سعادت ہے۔

فقہ کی حقیقت

امام ابو حنیفہؒ نہ صرف یہ کہ فقیہ تھے بلکہ امام الفقہا تھے۔ ہر فقیہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں جن کو وہ اپنی تحقیق کے دوران مدنظر رکھتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے بھی فقہی اور اجتہادی اصول ہیں جن کو وہ تدوین فقہ کے دوران مدنظر رکھتے تھے۔ ان اصولوں کے بیان سے پہلے فقہ کی حقیقت بیان کرنا مناسب ہے۔

لفظ فقہ کے اصل لغوی معنی تو ہیں الشق والفتح یعنی پھاڑنا اور کھولنا۔ کسی چیز کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس سے پردہ اٹھایا جائے اور صحیح و غلط کو الگ الگ کر دیا جائے۔ اس مناسبت سے لفظ فقہ علم و فہم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اہل اسلام کے عرف میں علم دین اور علم شریعت کو فقہ کہتے ہیں۔ علامہ جار اللہ زمخشری (ف ۵۸۳ھ) لکھتے ہیں: "فقہ کے حقیقی معنی ہیں پھاڑنا اور کھولنا اور

شیخ الحدیث ، دارالقرآن ، الجامعۃ الاسلامیہ تفہیم القرآن ، مردان

فقیہہ وہ ہوتا ہے جو احکام کا تجزیہ و تحقیق کرتا ہو، ان کے حقائق کی تفتیش کرتا ہو اور مبہم و مغلق احکام کو کھول کر واضح کرتا ہو" (الفائق فی غریب الحدیث، طبع بیروت، ۱۹۷۹، ج ۳، ص ۱۳۴)۔

علامہ جوہریؒ (ف ۳۹۳ھ) فرماتے ہیں: "فقہ کے معنی ہیں فہم، مگر بعد میں یہ لفظ علم شریعت کے لیے مخصوص ہو گیا ہے" (الصحاح للجوھری، طبع ۱۹۸۴، ج ۶، ص ۲۲۴۳)۔

ابن منظور افریقیؒ (ف ۷۱۱ھ) لکھتے ہیں: "فقہ کسی چیز کے جاننے اور سمجھنے کو کہتے ہیں لیکن اس کا اکثر استعمال علم دین کے لیے ہوتا ہے" (لسان العرب، ج ۱۳، ص ۵۲۲)۔

مذکورہ لغوی معنی کی مناسبت سے فقہ کے اصطلاحی معنی ہیں: دین اسلام کا گہرا اور تحقیقی علم اور حق و باطل کی معرفت اور تمیز۔

امام ابوحنیفہؒ سے فقہ کی تعریف اس طرح نقل ہوئی ہے:

فقہ نفس کو نفع پہنچانے والی اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کی پہچان کا نام ہے (تنقیح الاصول متن التوضیح)۔

یعنی زندگی کے ہر شعبے میں حق و باطل، حلال و حرام اور مفید و مضر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت کا نام فقاہت ہے۔ ائمہ لغت نے اسی عموم کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل اسلام کے عرف میں پورے دین اور پوری شریعت کے علم کو فقہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ دین اصول و فروع دونوں پر مشتمل ہے، صرف فروعی اور عملی احکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ قرآن کریم میں پورے دین کے علم کو فقہ کہا گیا ہے مثلاً: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ (التوبہ ۹: ۱۲۲) "ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے"۔

اسی طرح حدیث مرفوع میں آیا ہے کہ: من یرد اللّٰہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین، اللہ جس کے بارے میں خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں فقاہت دے دیتا ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ: ان رجالا یاتونکم من الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوابھم خیرا، کچھ لوگ تمہارے پاس مختلف علاقوں سے تفقہ فی الدین کے لیے آئیں گے۔ جب وہ آ جائیں تو تم ان کے بارے میں میری وصیت کے مطابق اچھا سلوک کرو۔

قرآن و سنت کی ان نصوص میں فقہ کی نسبت پورے دین کی طرف کی گئی ہے۔ صرف عملی اور فروعی احکام کے ساتھ فقہ کو مخصوص نہیں کیا گیا۔ امام ابوحنیفہؒ کی درج بالا تعریف انھی نصوص سے ماخوذ ہے۔

متقدمین اور سلف صالحینؒ نے فقہ کی تعریف عمومی الفاظ میں کی ہے اور اسے علم الفروع کے ساتھ مخصوص نہیں کیا لیکن متاخرین نے فقہ کو عملی احکام کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور وہ اس کی تعریف اس

طرح کرتے ہیں: "فقہ شریعت کے عملی احکام کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہو"۔ (تنقیح الاصول متن التوضیح)

اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ جب علم الکلام کے نام سے اصول و عقائد کی تدوین الگ ہوئی اور اصلاح القلوب و تزکیہ نفوس کے آداب و احکام علم تصوف کے نام سے الگ مدون ہوئے تو عملی اور فروعی احکام کو فقہ کا نام دیا گیا اور متاخرین کی اصطلاح میں فقہ علم الفروع کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔ فخرالاسلام بزدویؒ (ف ۴۹۳ھ) نے فقہ کے شرعی مفہوم میں تین اجزا کو شامل کیا ہے: "علم الفروع علم دین کی دوسری قسم ہے اور یہ فقہ ہے۔ فقہ کے تین اجزا ہیں۔ ایک ہے نفس احکام کا علم' دوسرا ہے اس علم کی پختگی یعنی نصوص کے معانی و علل کی معرفت اور اصول کا فروع پر انطباق' اور تیسرا جز ہے اس پر عمل کرنا تاکہ علم بالذات مقصود نہ بن جائے۔ جب یہ تینوں اجزا مکمل ہو جائیں تو انسان فقیہ بن جاتا ہے" (الاصول للبزدوی بر حاشیہ کشف الاسرار' طبع کراچی' ج ۱' ص ۱۲)۔

مسلم الثبوت کے مصنف محب اللہؒ بہاری (ف ۱۱۱۹ھ) نے بزدویؒ کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل بحث یہ نہیں کہ فقہ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں عمل شامل ہے یا نہیں بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ جس فقہ کی شارع اور صحابہؓ و تابعینؒ نے مدح و تعریف کی ہے وہ کیا چیز ہے؟ اس اعتبار سے بزدویؒ کی بات درست ہے' اس لیے کہ فاسق مدح و تعریف کا مستحق نہیں ہے اور فاسق کو غیر فقیہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ حجاج بن یوسف کو کسی نے بھی فقہا میں شمار نہیں کیا حالانکہ وہ احکام کو دلائل کے ساتھ جانتا تھا۔ (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت' طبع نو لکشور' لکھنؤ' ۱۸۷۸' ص ۸)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین کا وسیع اور تحقیقی علم رکھنے کے باوجود فسق و فجور میں مبتلا ہوں وہ فقہا کہلانے کے مستحق نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو قرآن میں "سفہاء" کا نام دیا گیا ہے۔ علم بلا عمل فقاہت نہیں ہے بلکہ سفاہت و حماقت ہے' اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے علم و فقہ بذات خود مقصود نہیں ہے۔

فقہ حنفی کے بنیادی مآخذ و مصادر

دین اسلام کا ماخذ و منبع وحی خداوندی ہے' اور وحی منحصر ہے قرآن و سنت میں۔ اس لیے تمام مجتہدین و فقہا کی فقہ کے مصادر قرآن و سنت کی نصوص ہوں گی یا وہ اصول ہوں گے جو ان نصوص سے ماخوذ ہوں۔ اختلافات جو بھی ہوں گے وہ نصوص کے فہم اور توجیہ و تطبیق میں ہوں گے یا پھر بعض ضمنی اور جزئی امور میں ہوں گے۔

ہمارا موضوع امام ابوحنیفہؒ کے فقہی اصول ہیں اس لیے پہلے امام صاحب کے اپنے اقوال مستند کتابوں

سے نقل کیے جاتے ہیں اور پھر ان کی روشنی میں ان کے فقہی اصولوں کی تشریح کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

خطیب بغدادیؒ (ف ۴۶۳ھ) نے سند کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ: "میں اللہ کی کتاب پر عمل کرتا ہوں، جب مجھے اس میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو لیتا ہوں۔ اگر مجھے کتاب و سنت دونوں میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر میں اصحاب رسولؐ کے قول کو لیتا ہوں۔ ان میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کے قول کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں مگر ان کے اقوال سے باہر نکل کر کسی اور کا قول نہیں لیتا۔ لیکن جب بات ابراہیم نخعیؒ، عامر شعبیؒ، ابن سیرینؒ، حسن بصریؒ، عطاؒ، سعید بن مسیبؒ اور اس درجے کے دوسرے افراد تک پہنچ جائے تو چونکہ ان لوگوں نے اجتہاد کیا تھا، پس میں بھی اجتہاد کروں گا جس طرح کہ انھوں نے اجتہاد کیا تھا"۔ (تاریخ بغداد، طبع دارالکتب العزلی، بیروت، ج ۱۳، ص ۳۶۸)

فضیل بن عیاضؒ (ف ۱۸۷ھ) نے امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ اجتہاد اس طرح نقل کیا ہے: "امام ابوحنیفہؒ کے پاس جب کوئی مسئلہ آجاتا جس کے بارے میں صحیح حدیث موجود ہوتی تو آپ اس کا اتباع کرتے۔ اگرچہ وہ صحابی کا قول ہوتا مگر جب کوئی حدیث (مرفوع یا موقوف) نہ ملتی تو پھر آپ قیاس کرتے تھے اور بڑے اچھے طریقے سے قیاس کرتے تھے"۔ (مناقب الامام الاعظم لموفق بن احمد المکی، طبع کوئٹہ، ۱۴۰۷ھ، ج ۱، ص ۷۵)

عبداللہ بن مبارکؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: "جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہم تک پہنچے تو وہ بسرو چشم تسلیم ہے اور جب صحابہؓ کے اقوال ہمارے پاس پہنچیں تو ہم ان میں سے کسی ایک رائے کو پسند کریں گے مگر جب تابعینؒ کے اقوال ہمارے سامنے آجائیں تو ہم ان کی مزاحمت بھی کر لیتے ہیں"۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۴۴)

نعیم بن عمروؒ فرماتے ہیں کہ: "میں نے ابوحنیفہؒ سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ تعجب ہے لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی رائے سے فتوے دیتا ہوں۔ حالانکہ میں تو حدیث پر فتوے دیتا ہوں"۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۷۷-۷۸)

عبدالکریم بن ہلالؒ کہتے ہیں کہ: "میں نے ابوحنیفہؒ سے خود سنا ہے، فرماتے تھے کہ میں جب کوئی حکم اللہ کی کتاب یا اس کے رسولؐ کی سنت میں پالیتا ہوں تو اسی پر عمل کرتا ہوں اور اس سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کرتا۔ جب صحابہؓ کے درمیان آرا کا اختلاف ہو تو میں ان کے اقوال میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اختیار کر لیتا ہوں مگر جب بعد کے لوگوں سے کوئی بات ہمارے پاس آجائے تو میں اسے کبھی لے لیتا ہوں اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں"۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۸۰)

زفر بن ھزیلؒ (ف ۱۵۸ھ) فرماتے ہیں: "مخالفین کی باتوں پر توجہ نہ دو! ابوحنیفہؒ اور ہمارے دوسرے اصحاب کسی بھی مسئلے میں کوئی بات نہیں کرتے تھے مگر قرآن و سنت اور صحابہؓ کے صحیح اقوال کے مطابق کرتے تھے اور پھر ان پر قیاس کرتے تھے"۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ا، ص ۸۳)

حسن بن زیادؒ (ف ۲۰۴ھ) کا قول ہے کہ: "امام ابوحنیفہؒ چار ہزار احادیث کے راوی تھے۔ دو ہزار حماد سے اور دو ہزار باقی اساتذہ سے"۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ا، ص ۹۰)

امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کے ان مستند اقوال سے ان کے جو فقہی اصول و مصادر ثابت ہوئے ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

کتاب اللہ

قرآن کریم تمام اصول و ماخذ کا اصل الاصل اور مصدر المصادر ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ○ (النحل ۱۶: ۸۹) "اور ہم نے اتاری ہے تم پر کتاب جو دین کی ہر بات بیان کرتی ہے اور ہدایت و رحمت ہے اور جو مسلمانوں کے لیے بشارت ہے"۔

قاضی بیضاویؒ (ف ۶۹۱ھ) فرماتے ہیں: "قرآن میں دینی امور میں سے ہر چیز کا پورا بیان ہے، تفصیلاً یا اجمالاً یا سنت اور قیاس کے حوالے کے ذریعے" (انوار التنزیل واسرار التاویل، طبع بیروت، ۱۹۸۸، ج ا، ص ۵۵۴، النحل)۔ یعنی جو بات حدیث رسولؐ میں بیان ہوئی ہو یا قیاس و اجتہاد کے ذریعے معلوم کی گئی ہو وہ بھی قرآن کا بیان ہے اس لیے کہ قرآن میں اطاعت رسولؐ کا حکم دیا گیا ہے اور اجتہاد و قیاس کی اجازت دی گئی ہے۔

امام جصاصؒ حنفی (ف ۳۷۰ھ) نے قرآن کے تبیان ہونے کی وضاحت اس طرح کی ہے: "جس حکم پر اجماع ہو چکا ہو اس کا ماخذ و مصدر بھی قرآن ہے، اس لیے کہ قرآن اس کے حجت ہونے پر دلالت کرتا ہے اور مسلمان سب گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اور جو احکام قیاس و اجتہاد اور استدلال کے باقی اقسام مثلاً استحسان اور خبر واحد سے ثابت ہوتے ہیں وہ سب کے سب قرآن ہی کا بیان ہے۔ پس دین کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو مذکورہ طریقوں سے قرآن نے بیان نہ کیا ہو"۔ (احکام القرآن للجصاصؒ، طبع دار احیاء التراث الاسلامی، بیروت، ج ۵، ص ۱۰، النحل)

امام شافعیؒ (ف ۲۰۴ھ) قرآن کی جامعیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اہل دین کو جو مسئلہ بھی درپیش ہو اس کے بارے میں اللہ کی کتاب میں راہنمائی موجود ہے"۔

اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

- بعض احکام قرآن کریم میں تفصیل و صراحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔
- بعض احکام قرآن میں ذکر ہوئے ہیں لیکن ان کی تفصیلات اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بیان کروائی ہیں۔
- بعض احکام کا ذکر قرآن میں نہیں مگر وہ اللہ کے رسول نے نافذ کیے ہیں اور اللہ نے اپنے رسولؐ کی اطاعت فرض کر دی ہے۔
- بعض احکام وہ ہیں جو اجتہاد کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور اللہ نے مجتہدین پر اجتہاد فرض کر دیا ہے۔ اس کے بعد قرآنی احکام کی مذکورہ اقسام اربعہ کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ (الرسالہ للشافعی، طبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۶۹، ص ۱۵ تا ۲۵)

قرآن کریم سے اخذ احکام اور استدلال کے اصول کی تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں لیکن ایک قاعدہ جامعہ یہ ہے کہ قرآن کی جس تعبیر و تشریح پر صحابہؓ کا اجماع ہو اور وہ اجماعی تعبیر امت مسلمہ میں قرناً بعد قرن چلی آ رہی ہو تو اس کے خلاف تعبیر و تاویل کرنا تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہو گی۔ لیکن جس آیت کی تعبیر و تاویل میں دور صحابہؓ سے اختلاف چلا آ رہا ہو اس میں ہر مجتہد کو حق حاصل ہے کہ وہ جس تاویل کو راجح سمجھے اسے اختیار کرے بشرطیکہ وہ تاویل و توجیہ صحیح الاسناد اور صریح الدلالت حدیث رسولؐ کے خلاف نہ ہو، اس لیے کہ جو تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو، وہ وحی پر مبنی ہوتی ہے اور وحی جلی و خفی دونوں کے خلاف کسی کا قول قبول نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث رسولؐ

حدیث رسولؐ کا حجت شرعی اور ماخذ دین ہونا قرآن کی آیات سے ثابت ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور یہ شرط نہیں لگائی کہ رسول کی اسی بات کو مانو جو قرآن میں مذکور ہو بلکہ غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح قضاء رسولؐ و امر رسولؐ کو تسلیم کرنا تقاضائے ایمان اور اس کی مخالفت کو موجب عذاب قرار دیا گیا ہے، چاہے وہ قضا و امر قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو۔ اس لیے تشریع احکام اور تنفیذ دین کے بارے میں اللہ کا رسول جو کہتا ہے، کرتا ہے یا جسے برقرار رکھتا ہے وہ سب کچھ وحی ہوتی ہے اور کتاب منزل کی تعلیم و تبیین، اللہ کے نبی کا فرض منصبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ تم اللہ اور رسولؐ سے آگے نہ بڑھو یعنی اپنی رائے یا کسی اور کی رائے کو قرآن و سنت سے آگے نہ کرو۔ باقی ائمہ کی طرح امام ابوحنیفہؒ بھی صحیح حدیث کے مقابلے میں نہ اپنی رائے کو ترجیح دیتے تھے اور نہ کسی اور کی رائے پر توجہ دیتے تھے۔ ان کے جو اقوال مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ پہلے نقل ہوئے ہیں ان میں نہ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ حدیث متواتر

یا مشہور ہو اور نہ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ خبرواحد کا راوی فقہ و اجتہاد میں معروف ہو۔

اسی طرح یہ قید بھی امام صاحب کے اپنے اقوال میں کہیں نظر نہیں آتی کہ خبرواحد کا راوی جب فقیہ و مجتہد ہو تو اس کی حدیث اسی وقت حجت بن سکتی ہے جب کہ وہ قیاس کے مطابق ہو۔ بلکہ ان اقوال میں بلاشرط و قید کہا گیا ہے کہ جو بات رسولؐ اللہ نے کہی ہو وہ ہم کو بسرو چشم قبول ہے اور میں رائے پر فتویٰ نہیں دیتا بلکہ حدیث پر فتویٰ دیتا ہوں۔

قیاس پر خبر واحد کی تقدیم کے لیے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط

فخرالاسلام بزدویؒ (ف ۴۸۲ھ) نے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ جو صحابیؓ فقہ و اجتہاد میں معروف نہ ہو اس کی روایت کی قیاس کے ساتھ اگر مطابقت و موافقت ممکن نہ ہو اور قیاس کا باب بالکل بند ہو گیا ہو تو اس ضرورت کی بنا پر اسے ترک کر دیا جائے گا (الاصول للبزدوی برحاشیہ کشف الاسرار، طبع صدف، کراچی، ج ۲، ص ۳۷۹)۔ لیکن یہ بات امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے مروی نہیں ہے اور اس پر حنفیہ کا اتفاق بھی نہیں ہے بلکہ یہ عیسیٰ بن ابانؒ (ف ۲۲۱ھ) کی رائے ہے جسے قاضی ابو زید دبوسیؒ (ف ۴۳۰ھ) اور بزدویؒ نے اختیار کیا ہے اور متاخرین نے ان کی متابعت کی ہے۔ مگر شیخ ابو الحسن کرخیؒ (ف ۳۴۰ھ) اور اکثر علما نے راوی کی فقاہت و اجتہاد کو شرط قرار نہیں دیا اور نہ خبرواحد کی حجیت کے لیے قیاس کے ساتھ مطابقت کو شرط قرار دیا ہے۔

امام عبدالعزیز بخاریؒ (ف ۷۳۰ھ) اصول بزدوی میں لکھتے ہیں: "جان لو کہ ہم نے جو یہ کہا کہ خبرواحد کے راوی کی فقاہت اس کی روایت کو قیاس پر مقدم کرنے کے لیے شرط ہے تو یہ عیسیٰ بن ابانؒ کا مذہب ہے جسے قاضی ابو زید دبوسیؒ نے اختیار کیا ہے اور اکثر متاخرین نے اس کی متابعت کی ہے۔ مگر شیخ ابو الحسن کرخیؒ اور ہمارے اصحاب میں سے اس کی متابعت کرنے والوں کے نزدیک خبرواحد کی قیاس پر تقدیم کے لیے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں بلکہ ہر عادل اور ضابط راوی کی خبرواحد قیاس پر مقدم ہے جب کہ وہ قرآن اور صحیح و مشہور حدیث کے خلاف نہ ہو۔ فخرالاسلام بزدویؒ کے بھائی صدر الاسلام ابو الیسر بزدویؒ (ف ۴۹۳ھ) نے فرمایا ہے کہ اکثر علما کا میلان اسی طرف ہے..... ابوحنیفہؒ سے یہ قول ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ اللہ و رسولؐ کی جو بات ہم تک پہنچ جائے وہ ہم کو بسرو چشم قبول ہے۔ سلف میں کسی سے یہ منقول نہیں ہے کہ خبرواحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لیے اس کے راوی کا فقیہ ہونا شرط ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک قول مستحدث ہے یعنی بعد میں بنایا گیا"۔ (کشف الاسرار شرح اصول بزدوی، طبع کراچی، ج ۲، ص ۳۸۳)

ابن امیر الحاجؒ حنفی نے بھی تحریر الاصول کی شرح التقریر والتحبیر میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی

نقل کیا ہے کہ خبر واحد کو قیاس پر مطلقاً ترجیح حاصل ہے خواہ اس کا راوی فقیہ ہو یا نہ ہو، اور خواہ وہ قیاس کے مطابق ہو یا مطابق نہ ہو۔ (التقریر والتحبیر، ج ۲، ص ۳۱۸)

اسی طرح محب اللہؒ بہاری نے بھی خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لیے اس کے راوی کا فقیہ ہونا شرط قرار نہیں دیا۔ (مسلم الثبوت مع فواتح الرحموت فی ذیل المستصفی، ج ۲، ص ۱۴۵)

تعارض کے وقت ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دینے کے لیے تو راوی کی فقاہت کو وجوہ ترجیح میں سے ایک وجہ ترجیح تسلیم کیا گیا ہے مگر قیاس پر خبر واحد کی تقدیم و ترجیح کے لیے اس شرط کا ذکر متقدمین میں سے کسی نے نہیں کیا۔

خبر واحد کے ذریعے قرآن کے عام اور مطلق حکم کی تخصیص و تقیید جائز ہے

مشائخ حنفیہ نے اصول فقہ کی کتابوں میں ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ قرآن کے مطلق یا عام حکم پر خبر واحد کے ذریعے کوئی قید لگانا یا تخصیص کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ قید لگانے اور تخصیص کرنے سے عام اور مطلق کی بعض جزئیات ختم ہو جاتی ہیں۔ قرآن کا کوئی حکم خبر واحد کے ذریعے منسوخ نہیں ہو سکتا کیونکہ خبر واحد اگرچہ حجت ہے مگر راویوں کی قلت کی وجہ سے اس کا ثبوت ظنی ہے اور قرآن کریم متواتر ہونے کی بنا پر حجت قطعیہ ہے اور ظنی دلیل قطعی دلیل سے ثابت شدہ حکم کی ناسخ نہیں بن سکتی۔ اس قاعدے پر شدید قسم کے اعتراضات ہوئے ہیں لیکن اس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قاعدہ امام ابوحنیفہؒ سے صراحتاً ثابت نہیں ہے۔ دوسری بات وہ ہے جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ (ف ۱۳۵۲ھ) نے کی ہے جس کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ: "بعض اعتراضات سوء تعبیر اور سوء فہم پر مبنی ہوتے ہیں، اس لیے میں اصولیین کے کلام کی تعبیر اس طرح کرتا ہوں کہ خبر واحد کے ذریعے کسی قید کی زیادت جائز ہے مگر ظنیت کے درجے میں جائز ہے۔ یعنی جو چیز قرآن سے ثابت ہو وہ رکن یا شرط یعنی فرض ہوتی ہے، اور جو چیز خبر واحد سے ثابت ہو وہ واجب ہوتی ہے یا مستحب۔ میری اس بات سے اصولیین کا قاعدہ تبدیل نہیں ہوتا بلکہ صرف اس کی تعبیر بدل جاتی ہے۔ ان کے نزدیک رکنیت اور شرطیت کے درجے کے اضافے کو تو زیادت کہا جاتا ہے مگر وجوب یا استحباب کے درجے کی زیادت کو زیادت نہیں کہا جاتا۔ ان کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ خبر واحد کے ذریعے قرآن پر رکنیت اور شرطیت کے درجے کی زیادت جائز نہیں ہے اور میرے قول کا مطلب یہ ہے کہ خبر واحد کے ذریعے وجوب کے مرتبے کی زیادت جائز ہے۔ لہٰذا میرے اور ان کے درمیان حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ البتہ اصولیین کی تعبیر سے خبر واحد کا مرتبہ ہلکا سا محسوس ہوتا ہے اور میری تعبیر سے خبر واحد کی اہمیت ابتدا ہی سے معلوم ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خبر واحد ہمارے نزدیک بھی اسی طرح واجب العمل ہے جس طرح کہ شافعیہ کے نزدیک واجب العمل ہے۔ میں نے یہ تعبیر المنار اور ہدایہ

کے کلام سے اخذ کی ہے"۔ (فیض الباری، طبع قاہرہ ۱۹۳۸ء، ج ۱، ص ۴۷-۴۸)

شاہ صاحب نے علامہ عبداللہ بن احمد نسفی (ف ۷۱۰ھ) کی کتاب المنار کی جس عبارت سے اخذ کر کے مذکورہ تعبیر اختیار کی ہے، وہ درج ذیل ہے: "رکوع و سجود کے حکم میں تعدیل ارکان کو فرض کے درجے میں شامل کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح آیت الوضو میں اعضا کو پے در پے دھونے، ترتیب کے ساتھ دھونے، اول میں بسم اللہ پڑھنے اور نیت کرنے کو اور آیت طواف میں طہارت کو شرط قرار دینا صحیح نہیں ہے"۔ (المنار متن نور الانوار، ص ۱۵ تا ۱۷)

"علی سبیل الفرض" کے الفاظ سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ خبرواحد کے ذریعے قرآنی حکم پر اضافہ فرضیت و شرطیت کے طور پر جائز نہیں ہے مگر وجوب اور استحباب کے درجے میں جائز ہے۔ تعدیل ارکان سے مراد ہے رکوع، سجود، قومہ اور جلسہ میں اطمینان کے ساتھ ٹھیرنا۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر فرض اور شرط نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا ثبوت خبرواحد سے ہوا ہے، آیت قرآنی یا خبرمتواتر سے نہیں ہوا۔ اسی طرح ولاء، ترتیب، تسمیہ اور نیت کا ثبوت اخبار آحاد سے ہوا ہے۔ اس لیے یہ وضو کے سنن میں شامل ہیں، فرائض و شرائط میں شامل نہیں ہیں۔ چھٹی مثال طواف کے لیے طہارت کی ہے کہ قرآن کریم میں طواف کے لیے طہارت کا حکم موجود نہیں ہے مگر خبرواحد میں اس کے لیے طہارت کا حکم موجود ہے۔ اس لیے طواف زیارت فرض اور رکن ہے اور اس کے لیے طہارت واجب ہے۔ یہ چھ مثالیں تو المنار میں بیان ہوئی ہیں اور ساتویں مثال ہدایہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ نماز میں مطلق قرات فرض ہے، اس لیے کہ قرآن سے ثابت ہے مگر فاتحہ اور اس پر کچھ زائد پڑھنا واجب ہے اس لیے کہ یہ خبرواحد سے ثابت ہے۔ (ہدایہ: بحث وجوب فاتحہ)

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے عام حکم پر خبرواحد صحیح الاسناد کے ذریعے کوئی قید لگانا یا اس میں تخصیص کرنا جائز ہے مگر یہ تقیید و تخصیص ظنیت کے درجے میں ہو گی۔ حقیقت میں یہ قرآن کی تعبیر و تشریح ہے جو خبرواحد کے ذریعے کی گئی ہے، نسخ نہیں ہے۔

اجماع امت

اجماع کے معنی ہیں "امت کے مجتہدین کا کسی زمانے میں کسی امر پر متفق ہو جانا"۔ یہ اہل سنت کے تمام ائمہ کے نزدیک حجت شرعیہ اور ماخذ احکام ہے، اس لیے کہ اس کا حجت ہونا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی یہ تھی کہ: "فیصلہ طلب معاملے میں اہل علم کا جس بات پر اجماع ہو جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے تھے"۔ (سنن دارمی، طبع بیروت ۱۹۸۷ء، ج ۱، ص ۷۰۔ مسند احمد، طبع دار صادر بیروت، ج ۲، ص ۱۲۶)

حضرت عمرؓ نے کوفہ کے قاضی شریحؒ کو لکھا تھا کہ: "اگر تیرے پاس ایسا معاملہ آ جائے جس کا حکم قرآن میں مذکور نہ ہو اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت بھی معلوم نہ ہو تو جس حکم پر لوگوں نے اتفاق کر لیا ہو (یعنی اہل علم نے) اس کو تلاش کر کے اسی کے مطابق فیصلہ کر لیا کرو"۔ (سنن دارمی، طبع بیروت ۱۹۸۷، ج ۱، ص ۷۱۔ ونحوہ فی النسائی، باب القضاء باتفاق اھل العلم)

حنفی اصول فقہ کے امام فخر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں: "اجماع سے ثابت شدہ حکم پر اعتقاد رکھنا واجب ہے اور اس پر عمل کرنا بھی لازم ہے۔ قطعی اجماع سے انکار کرنا کفر ہے"۔ (الاصول للبزدویؒ، طبع کراچی، ص ۲۴۵)

اجماع کی حجیت کے دلائل بیان کرنا اور اس کی اقسام کا ذکر کرنا اس وقت موضوع بحث نہیں ہے اور اہل سنت والجماعت کے درمیان یہ کوئی اختلافی مسئلہ بھی نہیں ہے بلکہ اجماع صحابہؓ کا حجت ہونے پر تو اہل ظاہر بھی متفق ہیں۔ اس وقت تو امام ابو حنیفہؒ کے فقہی اصول و ماخذ زیر غور ہیں۔ امام صاحب نہ صرف یہ کہ اجماع کو حجت اور ماخذ شریعت تسلیم کرتے تھے بلکہ آپ کی فقہ کی تدوین اجتماعی بحث و تحقیق کے طریقے پر ہوئی ہے اور آپ انفرادی رائے پر اجتماعی اجتہاد کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت علیؓ کے ایک سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: "ایسے معاملے میں جس کے متعلق قرآن و سنت میں کچھ معلوم نہ ہو سکا ہو، تم عبادت گزار فقہا سے مشورہ کر لیا کرو اور کسی کی شخصی رائے پر نہ چلو"۔ (مجمع الزوائد، باب الاجماع، ج ۱، ص ۱۷۸)

اس ہدایت رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ نے اپنے شاگردوں اور ممتاز اہل علم کی ایک مجلس بنائی تھی جس میں بحث و تحقیق کے بعد حل طلب مسائل کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ موفق الدین مکیؒ لکھتے ہیں: "ابو حنیفہؒ نے اپنا فقہی مسلک اپنے اصحاب کے درمیان مشاورت کے ذریعے مدون کیا تھا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے بلکہ مجلس بحث و تحقیق میں کوئی مسئلہ پیش کر کے شرکاے مجلس کی آرا سنتے تھے اور اپنی رائے سناتے تھے۔ بعض اوقات یہ مباحثہ و مناظرہ ایک ماہ سے بھی زیادہ دنوں تک جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ کسی رائے پر اتفاق ہو جاتا اور امام ابو یوسفؒ اسے قلم بند کر لیتے"۔ (مناقب الامام الاعظم، ج ۲، ص ۱۳۳)

امام ابو حنیفہؒ کی قائم کردہ اس مجلس بحث و تحقیق کے ارکان کی تعداد ۴۰ بتائی جاتی ہے جن کے اسما کو ترتیب وفات کے اعتبار سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ خاص مولانا سید احمد رضا خان بجنوریؒ نے مختصر تعارف کے ساتھ مرتب کر لیا ہے فجزاہ اللہ خیرا۔ (انوار الباری، شرح صحیح البخاری، طبع ملتان، ج ۱، ص ۱۷۱ تا ۲۲۱)

اس مجلس تدوین فقہ کے ارکان میں سے ۳۶ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ تھی: "میرے یہ ۳۶ اصحاب ہیں جن میں سے ۲۸ قاضی بننے کے اہل ہیں، ۶ فتویٰ دینے کے اہل ہیں اور ابو یوسفؒ و زفرؒ قاضیوں اور مفتیوں کو تربیت دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ (مناقب الامام للکردری، متوفی ۸۲۷ھ، فی ذیل المناقب للمکی، ج ۲، ص ۱۲۵)

یہی اجتماعی اجتہاد اور اجتماعیت و شورائیت فقہ حنفی کی امتیازی صفت ہے جس کی وجہ سے امت کی اکثریت اس کا اتباع کرتی ہے۔ مسائل کے حل کے لیے شورائیت و اجتماعیت کا قرآن و سنت نے حکم دیا ہے اور یہی خلفاے راشدینؓ بالخصوص شیخین یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ کی سنت تھی۔

اقوال صحابہؓ

اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے میں مشائخ حنفیہ کا اختلاف رائے تو موجود ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کا اپنا قول پہلے نقل ہو چکا ہے کہ: جب ہمارے پاس صحابہؓ کے اقوال آ جائیں تو ہم ان میں کسی ایک کو پسند کریں گے۔

قاضی ابو سعید البردعیؒ (ف ۳۱۷ھ) نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور حنفی اصول فقہ میں ابوحنیفہؒ کا مسلک اسی طرح نقل ہوا ہے۔ امام سرخسیؒ (ف ۴۹۰ھ) لکھتے ہیں: "ابو سعید البردعیؒ کہا کرتے تھے کہ صحابیؓ کا قول قیاس پر مقدم ہے اور اس کے قول کے مقابلے میں قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنے مشائخ کو اسی رائے پر پایا ہے"۔ (اصول السرخسی، طبع ریاض، ج ۲، ص ۱۰۵)

حنفیہ کے مشہور فقیہ ابو الحسن کرخیؒ (ف ۳۴۰ھ) کے نزدیک اگرچہ صحابیؓ کا قول قیاس پر مقدم نہیں ہے اور بعض حنفیہ نے ان سے اتفاق کیا ہے لیکن ہمارا موضوع ابوحنیفہؒ کے فقہی اصول کی وضاحت کرنا ہے اور ان کا قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ صحابیؓ کا قول قیاس و اجتہاد پر مقدم ہے۔ امام سرخسیؒ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ابو سعید البردعیؒ کا مسلک اصح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا امکان و احتمال موجود ہے کہ صحابیؓ نے جو بات کہی ہو، وہ اس نے رسولؐ اللہ سے سنی ہو گی، اس لیے کہ صحابہؓ کی یہ عادت تھی کہ ان میں سے جس کے پاس کوئی نص ہوتی تو کبھی وہ اسے نقل کر دیتے اور کبھی نقل کیے بغیر اس کے مطابق فتویٰ دے دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس بات میں رسولؐ اللہ سے سماع کا احتمال ہو وہ محض رائے پر مقدم ہونی چاہیے۔ اس اعتبار سے مجتہد کی رائے پر صحابی کے قول کو ترجیح دینا، خبرواحد کو قیاس پر مقدم کرنے کی طرح ہے۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ بات صحابیؓ کی اپنی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہے تو پھر بھی صحابہؓ کی رائے غیر صحابہؓ کی رائے سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لیے کہ انھوں نے مسائل و نوازل کے احکام بیان کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کا خود مشاہدہ کیا تھا اور ان حالات کو دیکھا تھا جن میں نصوص نازل ہوئی تھیں"۔ (اصول السرخسی، طبع ریاض، ج ۲، ص ۱۰۸، ونحوہ فی التلویح والتوضیح)

حنفیہ اور شافعیہ کی کتابوں میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ نقل ہوا ہے کہ مجتہد، صحابیؓ کے قول کو نظرانداز کر کے اپنے قیاس و اجتہاد پر عمل کر سکتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ کی اپنی تصنیف الرسالہ میں ان کا قول اس طرح نقل ہوا ہے: "ہم نے اہل علم کو پایا ہے کہ وہ صحابیؓ کے قول کو کبھی لے لیتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے اور بعض اقوال کے لینے نہ لینے میں ان کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ سائل نے پوچھا کہ آپ کا اپنا رجحان کس طرف ہے؟ میں نے کہا کہ میرا رجحان تو اس طرف ہے کہ میں جب کتاب و سنت اور اجماع میں کوئی حکم نہیں پاتا تو پھر صحابہؓ کے اقوال میں سے کسی ایک کے قول کا اتباع کرتا ہوں"۔ (الرسالہ للشافعی، طبع مصطفیٰ البابی، مصر۱۹۶۹، ص ۲۶۱)

حافظ ابن القیمؒ کی تحقیق یہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور امت کے نزدیک قرآن و سنت اور اجماع میں کوئی دلیل نہ ملتی ہو تو صحابیؓ کا قول حجت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے تو صراحتاً منقول ہے مگر امام مالکؒ کی کتاب موطا کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک بھی یہی ہے۔ اسحاق بن راھویہؒ اور ابوعبید قاسم بن سلامؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ امام احمدؒ سے بھی متعدد مقامات پر اسی طرح منقول ہے اور امام شافعیؒ سے مروی روایات میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ اس کے بعد حافظ ابن قیمؒ نے امام شافعیؒ کے اقوال نقل کیے ہیں۔ (اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۲۰ تا ۱۵۶)

امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ سے تو عدم حجیت کے اقوال بھی مروی ہیں بلکہ شافعیہ کے ہاں عدم حجیت کا قول متداول بھی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ سے مروی تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کتاب و سنت اور اجماع کے بعد صحابیؓ کے قول کو اپنے قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ آپ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے تھے، بشرطیکہ حدیث کا ضعف شدید نہ ہو بلکہ صرف راوی کے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے ہو۔

قیاس و اجتہاد

قیاس کے لغوی معنی ہیں اندازہ کرنا اور اصطلاحی معنی ہیں "کسی علت مشترکہ کی بنا پر غیر منصوص مسئلے پر حکم کو جاری کرنا"۔ امام جصاصؒ (ف ۳۷۰ھ) نے قیاس کے حجت ہونے پر ۲۲ آیات، ۳۹ احادیث اور اجماع صحابہؓ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اس کے بعد عقلی دلائل بیان کیے ہیں اور پھر قیاس کے منکرین کے اعتراضات و شبہات کے جوابات دیے ہیں۔ (الفصول فی الاصول، طبع مکتبہ علمیہ، لاہور، ص ۶۴ تا ۱۰۹۹)

امام سرخسیؒ (ف ۴۹۰ھ) فرماتے ہیں: "صحابہؓ، تابعینؒ و صالحین اور ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ رائے کے ذریعے ان اصول پر قیاس کرنا جن کے احکام نص سے ثابت ہوں تاکہ نص کا حکم فروع پر (غیر منصوص مسئلے پر) نافذ کر دیا جائے، جائز ہے جس کے ذریعے اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور یہ شرعی احکام کے

ماخذ میں سے ایک ماخذ ہے۔ لیکن قیاس و رائے میں ابتداً حکم کے اثبات کی صلاحیت موجود نہیں ہے"۔ (اصول السرخسی، طبع ریاض، ج ۲، ص ۱۱۸)

اجتہاد کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کی تلاش اور حصول کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کرنا اور ہر ممکن کوشش کرنا۔ اس کی اصطلاحی تعریف ہے "غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لیے علمی تحقیق و کاوش کرنا" (توضیح و تلویح، مصری، ج ۲، ص ۶۳۹)۔ یہ تعریف "اجتہاد قیاسی" کی ہے جو غیر منصوص مسائل کے احکام، نصوص سے مستنبط کرنے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن قاضی بیضاویؒ (ف ۶۹۱ھ) نے اجتہاد کی تعریف عام الفاظ میں کی ہے۔ یعنی شرعی احکام معلوم کرنے کے لیے پوری محنت و کوشش کرنا"۔ (منہاج الوصول برحاشیہ شرح تحریر الاصول، ج ۳، ص ۲۸۴)

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد صرف غیر منصوص مسائل و منصوص مسائل پر قیاس کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کی تعبیر کرنے اور احکام کو حالات و واقعات پر منطبق کرنے کو بھی اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اختلافی تعبیرات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کے لیے بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے مگر قرآن و سنت کی جس تعبیر پر صحابہؓ اور مجتہدین کا اجماع ہو چکا ہو، اس کے خلاف تعبیر کرنا اجتہاد نہیں ہے بلکہ تحریف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ قرآن، سنت، اجماع اور قول صحابیؓ سے کسی مسئلے کا حکم معلوم نہ کر سکنے کی صورت میں قیاس و اجتہاد پر فتویٰ دیتے تھے لیکن آپ نے فرمایا ہے: "اللہ کی قسم! جھوٹ بولتا ہے اور ہم پر الزام لگاتا ہے جو کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم سمجھتے ہیں۔ کیا نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم تو ضرورت کے بغیر قیاس نہیں کرتے"۔ (میزان کبریٰ للشعرانی، ج ۱، ص ۶۵۰)

موفق الدین مکیؒ نے زہیر بن معاویہ سے نقل کیا ہے کہ: "ایک روز ابوحنیفہؒ اور ابیض بن اغر کسی قیاسی مسئلے پر مباحثہ فرما رہے تھے کہ مسجد کے کونے سے ایک شخص نے جو میرے خیال میں مدینے کا رہنے والا تھا، باآواز بلند کہا: یہ کیا قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں؟ قیاس تو سب سے اول ابلیس نے کیا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے کہا کہ تیری یہ بات بے محل اور بے موقع ہے۔ ابلیس نے قیاس کے ذریعے اللہ کا حکم رد کر دیا تھا اور ہم غیر منصوص مسئلے کو قرآن و سنت اور اجماع امت میں سے کسی اصل پر قیاس کرتے ہیں اور اتباع کے لیے اجتہاد کرتے ہیں تو ہمارے اور ابلیس کے قیاس کے درمیان کیا مناسبت ہے؟ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ اللہ آپ کے دل کو نور سے بھر دے جس طرح کہ آپ نے میرے دل کو نور سے منور کر دیا ہے۔ یعنی شکوک کا ازالہ کر دیا ہے"۔ (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۸۱)

قیاس کا رکن اصلی علت ہے اور علت کے معنی ہیں وہ وصف جو حکمت و مصلحت پر مشتمل ہو، جس کی

بنا پر اصل کا حکم فرع پر بھی جاری کیا جا سکتا ہو۔ علت اگر منصوص یا اجماعی نہ ہو بلکہ استنباطی ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس کے معتبر ہونے اور حکم کا مدار بننے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک 'مناسبت' اور دوسری 'تاثیر'۔ مناسبت سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو علت قرار دیا گیا ہو اس کی حکم کے ساتھ معقول مناسبت ہو اور تاثیر کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو علت بنایا گیا ہو اس کا یا اس جیسی کسی اور علت کا کسی دوسرے مقام پر قرآن و سنت یا اجماع سے موثر ہونا ثابت ہو۔ یعنی صرف مناسبت کی بنا پر حنفیہ کے نزدیک قیاس جائز نہیں ہے بلکہ علت کا یا اس کی نظیر کا کسی نص یا اجماع سے موثر ہونا بھی ضروری ہے۔ حنفیہ نے موثر ہونے کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ قیاس، نصوص سے قریب تر ہو جائے اور اس کا استعمال کم سے کم کیا جائے۔ مگر فقہا شافعیہ کی اکثریت قیاس کے لیے "اخالہ" کافی سمجھتے ہیں۔ "اخالہ" کا مطلب یہ ہے کہ جب مجتہد کو کسی چیز کے علت ہونے پر اطمینان حاصل ہو جائے تو پھر دوسری جگہ اس کی تاثیر تلاش کرنا ضروری نہیں ہے۔

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟

مسائل و نوازل کا تغیر و تنوع ناگزیر ہے۔ اس لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا بھی ناگزیر ہے۔ اجتہاد، نبوت نہیں ہے جس پر ختم نبوت کی طرح ختم اجتہاد کی مہر لگ چکی ہو اور نہ خاتم النبیینؐ کی طرح امت میں کوئی خاتم المجتہدین ہے جس پر اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہو۔ امام عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں: "اگر تم پوچھو کہ اب (۱۰۰۰ھ میں) یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ائمہ مجتہدین کے مقام تک پہنچ سکے؟ تو جواب یہ ہے کہ ہاں ممکن ہے، کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لیے امتناع پر کوئی کمزور دلیل بھی موجود نہیں ہے"۔ (المیزان الکبری للشعرانی، ج ۱، ص ۳۸)

مشہور حنفی عالم مولانا عبدالعلی بحرالعلومؒ (ف ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں: "بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ علامہ نسفی کے بعد دنیا مجتہد سے خالی ہو گئی ہے۔ ان کی مراد مجتہد فی المذہب ہے ورنہ اجتہاد مطلق تو ان کے نزدیک ائمہ اربعہ پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امت پر انھی ائمہ اربعہ کی تقلید لازم کر دی ہے۔ یہ سب کچھ ان کا خیال محض ہے جس پر کوئی شرعی دلیل یہ لوگ پیش نہیں کر سکتے اور دلیل کے بغیر کسی کے ذاتی خیال کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے تو خود بھی گمراہ ہو جائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔ یہ لوگ جانتے نہیں کہ اجتہاد کے بند ہونے کی خبر غیب کی خبر ہے جس کا علم اللہ ہی کو حاصل ہے"۔ (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، برحاشیہ المستصفی بحث اجتہاد، ج ۲، ص ۳۹۹)

بحرالعلوم کی بات صحیح تو ہے مگر تھوڑی سی تلخ اور غیر متوازن معلوم ہوتی ہے کیونکہ عدم امتناع اور

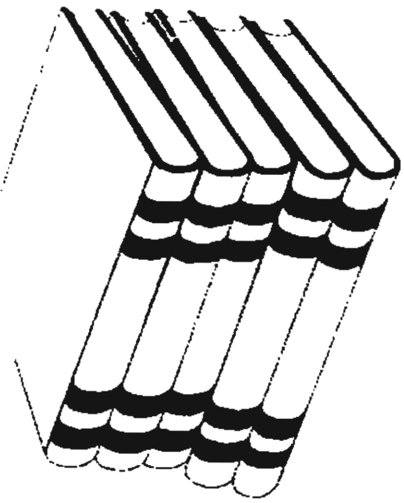
نفس امکان سے کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس پہلو سے جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ جواز اور امکان کے باوجود ائمہ اربعہ کے بعد ایسا مجتہد اب تک پیدا نہیں ہوا جس نے ان کے اصول اجتہاد سے بے نیاز ہو کر اجتہاد کیا ہو۔ البتہ ائمہ اربعہ کے اصول اجتہاد کی روشنی میں تفسیر آیات' تشریح احادیث' ترجیح فی الآراء اور مسائل جدیدہ کے حل کے لیے اجتہادی عمل ہر دور میں موجود رہا ہے اور جب تک اللہ چاہے گا موجود رہے گا۔ ظاہر ہے کہ نئے مسائل و نوازل کو نہ روکا جا سکتا ہے اور نہ حل کیے بغیر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر بحث و تحقیق اور فقہ و اجتہاد کے دروازے پر تالا لگا دیا جائے تو نئے مسائل کے شرعی احکام آخر کیسے معلوم کیے جائیں گے؟ علامہ شہرستانیؒ (ف ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں: "ہم اس بات کو قطعی اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ ہر واقعے کے بارے میں نص موجود نہیں ہے اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب نصوص محدود ہیں اور واقعات و مسائل غیر محدود ہیں اور غیر محدود چیزوں کا احاطہ محدود چیزیں نہیں کر سکتیں تو اس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد و قیاس کا اعتبار واجب ہے تاکہ ہر مسئلے کے لیے اجتہاد کیا جا سکے"۔ (الملل والنحل للشہرستانی' طبع مصطفیٰ البابی' مصر' ج ا' ص ۱۹۹)

اسی دلیل کی بنا پر شہرستانیؒ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ثم الاجتهاد من فروض الكفايات (ایضاً' ص ۲۰۵)۔ ابو اسحٰق الشاطبیؒ (ف ۷۹۰ھ) نے بھی اجتہاد کے جاری رہنے کے لیے وہی دلائل دیے ہیں جو شہرستانیؒ نے دیے ہیں (الموافقات للشاطبیؒ طبع بیروت' ج ۴' ص ۱۰۴)۔ لیکن اجتہاد کے لیے اہلیت اور اصول اجتہاد کی پابندی ضروری ہے۔ آج کل کے متجددین اور یورپین طرز کے مجتہدین' منصوص اور اجماعی احکام میں' ترمیم و تحریف کو بھی اجتہاد کا نام دے دیتے ہیں جس کی تردید علما ربانیین کا دینی فریضہ ہے۔ جسے وہ ہر دور میں ادا کرتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ ادا کرتے رہیں گے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق متجددین کے مقابلے میں مجددین' اور زائغین کے مقابلے میں راسخین وقت موعود تک موجود رہیں گے۔ (ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے زیر اہتمام منعقدہ بین الاقوامی امام ابوحنیفہؒ کانفرنس میں پڑھا گیا' ۶ / اکتوبر ۱۹۹۸)۔

48

خواتین کے لیے نادر تحفہ

"خوبصورت جہیز سیٹ"



پردہ ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

عصرِ حاضر میں اس موضوع پر لکھی جانے والی سب سے ممتاز کتاب جسے عالمِ اسلام میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کم کتابوں کے نصیب میں آتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اب تک اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک چکے ہیں۔

آسان فقہ ۔ محمد یوسف اصلاحی (حصہ اول، حصہ دوم)

باہمی اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کتاب میں صرف وہی متفقہ عملی مسائل اور کتاب وسنت کی روح ومنشا کے مطابق ان کے حل پیش کیے گئے ہیں جو عام زندگی میں پیش آتے ہیں۔

آدابِ زندگی ۔ محمد یوسف اصلاحی

اپنی زندگیوں کو اسلامی آداب سے ہتانے اور سنوارنے کی آرزو رکھنے والوں کیلئے نادر تحفہ

راہِ عمل ۔ مولانا جلیل احسن ندوی

ہادیٔ اعظم نبی اکرم ﷺ کے مبارک اقوال وافعال کی روشنی میں اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں ڈھالنے کے لیے رہنما کتاب۔

حسنِ معاشرت اور اس کی تکمیل میں خواتین کا حصہ ۔ محمد یوسف اصلاحی

ان خواتین کے لیے جو اپنے فرائض کے گہرے احساس، پرسوز جذبات اور مجاہدانہ کوششوں سے اس خاکے میں رنگ بھر سکتی ہیں۔

قیمت مکمل سیٹ -/800 روپے   رعایتی قیمت -/500 روپے

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

13-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور فون : -7669546 - 7664504 فیکس: -7658674

شوروم : - 10-چیمبر جی روڈ اردو بازار لاہور

اسلامی تحریک کا مستقبل: چند اہم مسائل

راشد الغنوشی ○

اخذ و ترجمہ: مسلم سجاد

اسلام اور مغرب

کسی بھی معاشرے کے مسائل کا حل' معاشرے کے اپنے پاس موجود ہوتا ہے' تاہم دیگر عوامل کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت مغرب کا کردار منفی ہے اور اس کی وجہ ان کا یہ خیال ہے کہ اگر [احیاے اسلام کے نتیجے میں مسلم ممالک میں] تبدیلی آئی تو متبادل' اسلام ہوگا' اور یہ کتنا ہی معتدل کیوں نہ ہو' ان کو پسند نہیں ہے۔ لیکن تبدیلی ناگزیر ہے' یہ اللہ کی مرضی سے واقع ہوگی۔ یہ اللہ ہے' نہ کہ مغرب' جو' جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔

دنیا میں کئی سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ سب مغرب کو پسند نہ تھیں۔ لیکن مغرب کو انھیں حقیقت تسلیم کرنا پڑا۔ عوامی جمہوریہ چین کی حکومت کو تسلیم کرنے میں امریکہ کو طویل زمانہ لگ گیا' لیکن آخرکار امریکہ کو چین کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ یہی معاملہ اب اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس وقت اسلام کو ہوا سمجھنے والوں کی آواز میں بہ ظاہر زور ہے' اور معاملات ان کے ہاتھ میں ہیں تاہم مغرب میں ایسی تحریک موجود ہے جو اسلام کے ساتھ تعمیری رابطے میں یقین رکھتی ہے۔

اگر اسلام اور مسلمان کی قسمت اپنے وقت کے عالمی نظام کے تابع ہوا کرتی تو دونوں میں سے کوئی بھی مغرب کے نوآبادیاتی تسلط اور عالمی غلبے کے صدیوں کے اثرات سے باقی نہ بچتا۔ اس کے برعکس' ان داخلی اور خارجی عوامل کے باوجود جو ترقی کو روکتے رہے' اسلام آج اس رفتار سے پھیل رہا ہے جو اس کے اقتدار کے ہزار سال میں بھی نہیں تھی۔ مستقبل اسلام کا ہے اور یہی اللہ کی مرضی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیر سے نہیں' جلد ہی یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے گی کہ اسلام اور مسلمان ہماری دنیا کا ایک حصہ ہیں۔ ضروری

○ تحریک اسلامی تیونس النہضہ کے سربراہ' مقیم لندن

نہیں ہے کہ ہر شخص اسلام سے اتفاق کرے، نہ ہی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ غیر اسلام سے اتفاق کریں۔ لیکن متفق نہ ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آپ دشمن بن جائیں۔ تہذیبیں ایک دوسرے سے مکالمہ کرتی ہیں، لڑا نہیں کرتیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آج کا مغرب تیونس میں یا کہیں بھی اسلامی تبدیلی کے حق میں نہیں ہے۔ تاہم اگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ایسا کیوں ہے، تو ہم اس منفیت (negativism) کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ منفی رویہ تاریخی ہے اور دراصل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ (اجنبی اور نامعلوم کا خوف!)۔ لہٰذا یہ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، چاہے وہ مقامی ہوں یا باہر سے آئے ہوں، کہ وہ ناواقفیت اور تعصب کی ان خلیجوں کو پاٹنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

دیانت داری کا تقاضا ہے کہ میں اس بیرونی عالم کے مثبت پہلوؤں کو تسلیم کروں۔ تیونس کی تحریک اسلامی کے افراد ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ، لائرز کمیٹی، انٹرنیشنل فیڈریشن آف ہیومن رائٹس جیسی تنظیموں کے ان اقدامات کے لیے ممنون ہیں جو انھوں نے تیونس میں آزادی اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے والوں کے حق میں کیے اور اب بھی کر رہے ہیں۔

مغرب نے ہزاروں مسلمان مہاجرین کا استقبال کیا ہے، انھیں پناہ فراہم کی ہے اور موقع فراہم کیا ہے کہ اپنی زندگی کو از سرنو شروع کریں۔ انھیں اظہار رائے کی آزادی دی ہے۔ اس سے اس دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ جب قرون وسطیٰ میں عیسائی، چرچ کی تفتیش اور ظلم سے فرار حاصل کر کے انھی ساحلوں سے اس وقت کی اسلامی دنیا کا رخ کرتے تھے جو اس زمانے میں آزادی اور امن کی جنت تھی۔

انتہا پسندی اور منفی رجحانات کو ایک طرف رکھتے ہوئے میں مسلمانوں اور مغرب کے درمیان نئی مفاہمت کو، خصوصاً وہ جو غیر حکومتی سطح پر استوار ہوئی ہے، امید کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ بلاشبہ اس سمت میں طویل سفر باقی ہے۔ مسلمان اور مغرب دونوں کو اپنے اپنے لگے بندھے تصورات (stereotypes) سے آگے جانا ہے اور حقیقت کی اصل تک پہنچنا ہے اور وہ ہے: انسانیت کی وحدت۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

> اے بنی نوع انسان، ہم نے تم کو مرد اور عورت کے ایک جوڑے سے پیدا کیا اور پھر تمھیں قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو جان سکو، بے شک اللہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (الحجرات ۴۹: ۱۳-۱۴)۔

اسلام اور جمہوریت

میرے خیال میں اسلامی تحریکوں اور جمہوریت کو سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے۔

اول' یہ غلط ہے کہ تقریباً تمام اسلامی تحریکوں نے اپنے مقاصد کو جمہوریت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ اس لیے کہ بہت سے تو لفظ جمہوریت کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مغرب کی بدنام نو آبادیاتی تاریخ کا تسلسل ہے اور ان کے اسلامی تصورات کی بنیاد سے ٹکراتا ہے۔ بہت سے اسلامی اہل قلم ابھی تک اس اصطلاح کے استعمال کے جواز پر بحث کر رہے ہیں۔ اس بحث کا آغاز مولانا مودودیؒ نے کیا تھا اور بعد میں سید قطب شہیدؒ کی فکر نے اسے آگے بڑھایا۔ علاوہ ازیں کچھ نئی اسلامی تحریکیں ہیں جو اس کی شدید مخالف ہیں۔ لگن کے ساتھ جمہوریت کا دفاع کرنے والے درحقیقت بہت کم ہیں۔

اسلام پسندوں کے بار بار کے اور بڑھتے ہوئے مطالبات کے باوجود کہ انھیں جمہوری عمل میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے' مسلمان حکومتیں عموماً انھیں اس عمل میں شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ چند ایک ہی عرب یا مسلمان ممالک ایسے ہیں جو جمہوریت پر عمل پیرا ہیں' اس لیے اسلام پسند عام طور پر جمہوریت کے دائرے سے باہر وجود رکھتے ہیں۔ ان کو عموماً نظرانداز کیا جاتا ہے یا پھر انھیں تصادم پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ بہت کم ہیں جنھیں سیاسی عمل کا حصہ بننے دیا گیا۔ اس طرح بدقسمتی سے انھیں مجبور کر دیا جاتا ہے کہ دیگر متبادل راستے اختیار کریں۔

دوم' تبدیلی کا عمل' بیشتر صورتوں میں ایک گروہ کا آزادانہ انتخاب نہیں ہوتا بلکہ معروضی حقائق کی ضروریات اور امکانات کے تحت مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ نہیں تو ایسا کیوں ہوا کہ الجزائر کا اسلامی گروپ جمہوری فضا میں وجود میں آیا اور بعدازاں جہادی گروپ میں تبدیل ہو گیا لیکن ہمسایہ ملک کی اسلامی تحریک کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسی طرح ایران میں شاہ ایران کے ظلم و استبداد کے خلاف اسلامی تحریک کا روعمل مختلف تھا' نہ تو اس نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور نہ ہی یہ تبدیلی جمہوریت کے راستے آئی۔ سوڈان کی تحریک نے عوام کی حمایت سے فوج کے ادارے کے ذریعے تبدیلی لانے پر انحصار کیا۔

اس تنوع کی وجہ کیا ہے جب کہ اسلام ایک اور یکساں ہے؟ معروضی حالات' جغرافیائی و تاریخی عوامل اور افراد کی صورت حال' یہ سب اس کی وجہ ہیں۔ اس لیے تبدیلی کا طریقہ کسی بھی اسلامی تحریک کے لیے ایک قطعی واضح راستہ نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص معروضی حقیقت کی تشکیل کردہ مساوات (equation) کا آخری نتیجہ ہوتا ہے۔

سوم' یہ فرض کر لینا غلط ہے کہ جمہوریت کا تصور مکمل طور پر مغرب کا تصور ہے' حقیقت یہ ہے کہ یہ انسانی ورثے کا حصہ ہے۔

چہارم' اسلامی تحریک کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح اسلام کا تصور' جمہوریت کے بغیر

بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ایران میں شاید خاتمی کے صدر بننے تک کے دور میں ہوا' اور بیشتر اسلامی تاریخ میں جمہوریت یعنی امت کا اپنے حکمرانوں (شوریٰ) کو منتخب کرنے کی روایت موجود نہیں رہی ہے' اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمہوریت کو اسلام کے بغیر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک غیر عادلانہ اسلامی ریاست اور ایک عادلانہ غیر اسلامی ریاست کا تصور ممکن ہے۔ اس صورت میں اسلامی بصیرت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ عادلانہ ریاست کی خوش حالی اور ترقی کی امید کی جائے چاہے وہ غیر اسلامی کیوں نہ ہو' اور غیر عادلانہ ریاست سے کرپشن اور انحطاط کی توقع کی جائے چاہے وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہو۔

جمہوریت اور انسانی حقوق کی موجودگی وہ مثالی صورت ہے جس میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جا سکتی ہے اور اسلامی ریاست قائم کی جا سکتی ہے' لیکن اسلام ان کے لیے ناگزیر نہیں' البتہ اسلام ہی میں ان اقدار کا مثالی تصور اور عمل کے لیے مثالی ماحول ملتا ہے۔ اگر اسلام پسند جمہوریت کے حق میں کلمہ خیر کہتے ہیں تو اس کی وجہ ان کے مذہب کی تعلیمات ہیں جو شورائیت' عدل اور حکمت و دانش کی بات کو کسی بھی جگہ سے حاصل کر لینے کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا ہے کہ دو متبادل ہوں تو زیادہ آسان کا انتخاب کیا جائے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جمہوریت آسان تر ہے اور اسلام کی روح کے قریب تر بھی۔

اس کا ایک واضح ثبوت مسلمانوں کا' غیر عادلانہ مسلم ممالک سے عادلانہ غیر مسلم ممالک کی طرف اس وجہ سے ترک وطن کر کے آنا ہے کہ اسلام عدل کے ماحول میں خوب پھلتا پھولتا ہے۔ اس لیے جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ المکرمہ میں تھے تو آپؐ نے لوگوں تک دعوت پہنچانے کی آزادی چاہی۔ دوسری صورت میں' مسلمانوں کا ترک وطن' اور مغرب میں لاتعداد اسلامی کانفرنسوں کا انعقاد اور مطبوعات کی بڑھتی ہوئی تعداد (بشمول امپیکٹ) کی آپ کیا توجیہ کریں گے۔ آپ اور آپ کے رفقا کسی مسلم ملک مثلاً تیونس میں رہنے کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ یہاں جمہوری فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں' چاہے یہاں اسلامی ریاست نہ ہو۔

اسلامی تبدیلی کی حکمت عملی

یہ حقیقت ہے کہ معاصر اسلامی معاشرے کے نمونے کی وضاحت اور دیگر نمونوں کے ساتھ اس کی مشابہت اور اختلاف کے تعین کے لیے بڑی کوششیں کی گئی ہیں لیکن ابھی اس میدان میں بڑے کام کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی ریاست کے اندر اور باہر' مسلموں اور غیر مسلموں کے انفرادی و اجتماعی حقوق کی یکساں حفاظت سے اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی وابستگی کے بارے میں کوئی ابہام نہ رہے۔ اسی طرح خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بھی۔ تشدد پسندی' دہشت گردی' تکفیر اور محض رائے یا

عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے انسانی زندگی' عزت اور مال پر حملوں کو اسلام سے جوڑنے کی روش ترک کی جائے۔ ان واقعات کو الگ کر کے دیکھنا چاہیے تا کہ اسلام کی جو خوف ناک تصویر بنا دی گئی ہے' وہ درست ہو جائے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی انقلاب کی حکمت عملی پر اس وجہ سے بھی بڑی بحث باقی ہے کہ حقوق آزادی کی خاطر' مسلم یا غیر مسلم استبداد کے مقابلے کے لیے ہتھیار اٹھانے کے جواز کے بارے میں غیر یقینی کیفیت ہے۔ میرا خیال ہے کہ افغانستان اور الجزائر میں خون بہنے کے بعد جس سے خوارج کے فتنے کی یاد آ جاتی ہے' اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اس امر پر متفق ہو جائیں کہ اپنے اندرونی اختلافات کے حل کرنے کے لیے تشدد کا راستہ ترک کر دیں گے۔ طاقت کا استعمال اسی وقت درست ہے کہ جب اسلام کی سرزمین پر غیر ملکی حملہ آور ہو جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ برعظیم پاک و ہند میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی اسلامی فکر کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ باقاعدہ اعلان شدہ جہاد کے علاوہ تشدد کے استعمال کے ناقابل قبول ہونے کا مسئلہ طے ہو گیا ہے۔ اس سے علاقہ (افغانستان میں جو کچھ ہوا اس سے قطع نظر) باہمی جنگ و جدل سے محفوظ ہو گیا جب کہ عالم عرب میں یہ بات طے نہ ہونے کی وجہ سے کئی تباہ کن واقعات رونما ہوئے۔

تبدیلی کا طریقہ یقیناً حرکی (dynamic) ہے' لیکن تحدیدات (limits) کے بغیر نہیں۔ حدیث ہے: "تم میں سے جو منکر کو ہوتا دیکھے' اسے ہاتھ سے مٹا دے' اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے برا کہے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو پھر دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے" (مسلم)۔ اس حدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ تبدیلی کی حکمت عملی جامد نہیں ہے اور حقیقت اس قدر پیچیدہ ہے کہ صرف ایک سادہ حل کافی نہیں ہے۔ اسلامی فکر میں تبدیلی کے ایسے نظریے کی گنجایش ہے جو حقیقت کی تمام پیچیدگیوں کو سلجھا سکتا ہے۔

اس طرح تبدیلی کے ایک کے بجائے کئی راستے سامنے آتے ہیں۔ کسی ایک طریق کار کو نظری طور پر بیان کیا جا سکتا ہے لیکن جو صورت حال تبدیل کرنا ہے' اس کی معروضی حقیقت ہی طریق کار متعین کرے گی۔ یہی مذکورہ بالا حدیث میں لفظ "استطاعت" کا مفہوم ہے۔ یہ "استطاعت" فقہ کی کتابوں کے مطالعے سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ حقیقت حال کے علم سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی ہم عصر اسلامی فکر کی سب سے بڑی خامی ہے کہ اس میں نظریاتی اور تصوراتی حل زیادہ غالب اور نمایاں ہیں۔ اس میں کسی زیر غور صورت حال کے اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں اور اس پر اثر انداز ہونے والے اندرونی بیرونی عناصر کے ایسے مطالعے کو نظرانداز کیا گیا ہے جس سے تبدیلی کے لیے کوئی مخصوص حکمت عملی اختیار کی جا سکے۔ قرآن کا ہم سے مطالبہ ہے: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۶۴:۱۶) "لہٰذا جہاں تک تمھارے بس میں ہے اللہ سے ڈرتے رہو"۔ آخر ہم اپنی "استطاعت کی حد" کو کس طرح معلوم کریں گے جب تک حقیقت کے مطالعے

کا اہتمام نہ کریں۔ ہمارے پاس بہت سے مسلم قانون ساز ڈاکٹر اور انجینئر ہیں لیکن تاریخ' اقتصادیات' نفسیات' سماجیات اور معاشریات کے ماہرین مقابلتاً بہت کم ہیں۔ اس صورت میں ہم اس "استطاعت" کا تعین کیسے کریں جسے تبدیلی لانے کے مختلف طریقہ ہاے کار میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔

یہ ان وجوہات میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے روایتی اور معاصر اسلامی فکر کی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور ان میں خامی رہی ہے۔ یہ دراصل شریعت کے علوم کے مقابلے میں معروضی حقائق کے علوم سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہے۔ جب تک ہم اس خامی کو دور نہ کریں گے' علاقائی اور عالمی صورت حال اور ان کے آگے بڑھنے کی سمت کے بارے میں ہمارے اندازے درست نہ ہوں گے' ان غلط اندازوں پر تبدیلی کی جو حکمت عملی تشکیل دی جائے گی وہ تباہ کن ہو گی۔ عظیم مفکر فتحی یکن کے الفاظ میں اس طرح اسلامی سرگرمیاں پہلے تعیر' پھر تخریب اور پھر تعیر کا عمل ہوں گی یعنی ایسا عمل جس میں پیش رفت (of action dynamic) نہ ہو۔

اسلامی تحریکوں میں خود احتسابی کا شاذ ہونا اور تخلیقی اختراع کے مقابلے میں اندھی تقلید کو ترجیح دینا' اس کی وجہ ہے۔ روایتی علما کے حوالے مسلسل دیے جاتے ہیں اور ان کے کیے ہوئے کاموں کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ ان میں حق و باطل اور حرام و حلال کے مجرد اصول ہماری موجودہ حقیقت سے قطع نظر بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی تنقیح سماجی علوم کے غیر ماہرین کے لیے ممکن نہیں' نہ وہ اس کے ارتقا کو سمجھ سکتے ہیں' اور نہ ہم ان کے مطالعے سے ہی اسلامی تبدیلی کی حکمت عملی کا تعین کر سکتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ہم اس خاص پہلو کے حوالے سے آگے بڑھیں' پیچھے نہ آئیں۔ "سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اس پر میں نے بھروسا کیا اور ہر معاملے میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں" (ھود ۱۱: ۸۸)۔

تیونس کی اسلامی تحریک النہضۃ

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس تحریک نے جس کی نشوونما مسلم دنیا کے سب سے زیادہ مغرب زدہ ماحول میں ہوئی' اپنی حکمت عملی پر نظرثانی کرنے' مقاصد کے حوالے سے پیش رفت کا جائزہ لینے اور مستقبل کے سفر کے لیے مناسب سبق حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ وقت نکالا ہے۔

ہماری تحریک کی نشوونما میں ایسے دو جائزے غیر معمولی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ پہلا' بنیاد رکھے جانے اور ۸۶-۱۹۷۰ میں ابتدائی نشوونما کے دور سے متعلق ہے' دوسرا ۹۵-۱۹۸۶ کے دور کا جائزہ ہے۔

تحریک کی مثبت خصوصیات میں تحریک کی علمی اور تخلیقی سوچ ہے۔ اس سوچ کی بدولت تحریک نے اندھی تقلید کا راستہ ترک کر کے نئے تصورات کو اپنی سیاسی فکر میں جذب کیا جیسے جمہوریت' حقوق انسانی'

مہذب معاشرہ اور خواتین کی شرکت' اور ان تصورات کو اسلامی اقدار کے قالب میں ڈھالا۔ اس کی بدولت تحریک کے لیے ممکن ہو گیا کہ تشدد اور نام نہاد ریڈیکل ازم کے راستے سے احتراز کرے' جس سے کئی چھوٹے گروہوں نے نقصان اٹھایا ہے۔ تحریک اس قابل ہو گئی کہ نظریاتی مشکلات کے بغیر مغرب کے ساتھ مکالمہ کرے۔ ہماری تحریک جدیدیت کے دور میں اسلامی دروازے سے داخل ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسے اسلامی نظریے سے مسلح ہے جو ظلم کو مسترد کرتا ہے' اور ریاست کا قانونی جواز عوام الناس کی رضامندی سے مشروط کرتا ہے۔

اسلامی تحریک کے علم برداروں کی حکومت کے جواز کی بنیاد وہی ہے جو کسی اور سیاسی گروہ کی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنا پروگرام عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ صرف عوام کو حق حاصل ہے اسے قبول کر لیں یا اسے مسترد کر دیں۔ یہ مسئلہ پریشانی کا باعث بنتا ہے کہ اگر عوام نے اسلام پسند پارٹی کو رد کر دیا اور سیکولر پارٹی کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کیا' تب کیا ہو گا؟ جس مسلم معاشرے میں اپنی اقدار کا شعور موجود ہو اس میں یہ امکان بڑی حد تک نہیں ہے۔ تاہم' کھیل کے قوانین کو تسلیم کرتے ہوئے' یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عوام کی مرضی کے مطابق حکومت میں تبدیلی آتی رہے' اسلامی تحریک دوسری جماعتوں کے ساتھ اپنے معاہدوں کی پاسداری کرے گی۔ اسی طرح' امید ہے کہ دوسرے گروہ بھی اپنے معاہدے کے پابند رہیں گے اور اسلامی تحریک کے افراد کو ان کا اقتدار ختم ہونے کے بعد قید' جلاوطنی یا موت کی سزا دینے سے باز رہیں گے۔ ایوان اقتدار سے باہر رہنے کا وقفہ اسلامی تحریک کو یہ موقع دے گا کہ وہ اپنا جائزہ لے' مسلمانوں کو اپنے پروگرام پر مطمئن کرنے میں ناکامی کی وجوہات معلوم کرے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرے۔ اگر وہ سوال کا صحیح جواب فراہم کر سکیں گے تو یقینی طور پر دوبارہ برسراقتدار آئیں گے۔ ہمیں مسلمانوں کی راست روی پر اعتماد رکھنا چاہیے کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت ضلالت پر کبھی مجتمع نہ ہو گی اور جب تم میں اختلاف ہو تو اکثریت کا راستہ اختیار کرو (ابن ماجہ)۔

ہمارے جائزے میں جو منفی نکتہ ابھر کر سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اپنی قوت اور اپنے مخالفین کی قوت کا اندازہ لگانے میں ہم سے غلطی ہوئی۔ نیز قومی حالات کی تشکیل میں علاقائی اور عالمی عناصر کی اہمیت کا ہم کماحقہ ادراک نہ کر سکے۔

ہماری خامیوں میں سے ایک خامی یہ بھی رہی کہ ہم کچھ افراد کے اقدامات کے بارے میں' جو تحریک کی پالیسیوں کے خلاف تھے' انضباطی کارروائی کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے تحریک پر بحیثیت مجموعی تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ (ماخوذ از امپیکٹ' لندن' دسمبر ۹۸ء)۔

کشمیر کے وفا شعار آپ کی توجہ چاہتے ہیں

کشمیر کے شہیدوں' مجاہدوں' زخمیوں اور اسیروں کی بے یار و مددگار مائیں' بہنیں' بچے اور وفا شعار مجاہد جو بھوک' بیماری' برف اور بارود کی بارش میں قابض بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں

وہ جو تکمیل پاکستان کے لیے اپنی جانیں لٹا رہے ہیں

ان کے اجڑے گھروں کو بھی یاد رکھیں

کشمیر .... جہاں

۶۱۱۹۰ بچے' بوڑھے' خواتین اور جوان شہید ہوئے۔ ۸۶۳۲۷ زخمی ہوئے۔ ۵۶۶۱ عقوبت خانوں میں بند ہیں۔ ۶۵۷۵ نوجوان معذور ہیں۔ ۴۲۱۰۰ افراد ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ۳۸۱۵۳ گھر اور اسکول جلا دیئے گئے۔ اور کنٹرول لائن پر حالیہ بھارتی گولہ باری سے ہزاروں خاندان بے گھر ہوئے۔

ان کے لیے اپنے نقد

عطیات | **صدقات** | **زکوٰۃ**

الگ الگ

چیک / ڈرافٹ بنام جناب عبدالرشید ترابی اکاؤنٹ نمبر 1797 بنوا کر درج ذیل پتہ پر ارسال کریں۔

اور اجناس (گرم کپڑے' کمبل' بستر اور راشن) جماعت اسلامی کے قریبی دفاتر میں جمع کرائیں یا براہ راست ذیل پتہ پر بھجوائیں

عبدالحلیم خان (مرکزی ناظم مالیات) جماعت اسلامی' آزاد جموں و کشمیر

415- پونچھ ہاؤس' صدر' راولپنڈی
فون : 511417 - 051
فیکس : 510197 - 051

یا

عیدگاہ روڈ' مظفر آباد' آزاد جموں و کشمیر
فون : 5482 , 4336 , 2334 - 0581
فیکس : 2580 - 0581

اخبار امت

عراق پر امریکی حملے: پس منظر و پیش منظر

حافظ محمد ادریس

دنیا کی نام نہاد سپر طاقت امریکہ نے ۱۷/دسمبر ۱۹۹۸ کو اپنے بعض اتحادی ممالک خصوصاً برطانیہ کے ساتھ مل کر عراق پر جو ظالمانہ حملے کیے ہیں، بحیثیت مجموعی دنیا میں ان پر احتجاج کیا گیا ہے۔ ان حملوں کو کسی بھی پیمانے سے منصفانہ اور جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان حملوں کی اصل وجہ کیا ہے؟ یہ کوئی سربستہ راز نہیں ہے۔ دراصل خلیج میں دو چیزوں کو امریکہ کی تمام پالیسیوں میں بڑی اہم اور نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان میں پہلی اسرائیل ہے اور دوسری پٹرولیم کی ثروت۔ اسرائیل اپنے قیام کے وقت سے لے کر آج تک امریکہ کا منظور نظر ہے اور اس کی حفاظت اور اس کو پیش آنے والے تمام خطرات کا دفاع امریکہ اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ پھر خلیجی علاقے میں تیل کی دولت امریکہ کو بہت عزیز ہے اور امریکہ اس دولت پر عملاً قبضہ کر چکا ہے۔ اپنے اس قبضے کو دوام دینے کے لیے وہ ہر حربہ اختیار کرنا اپنا جائز اور قانونی حق سمجھتا ہے۔

عراق عرب دنیا کا ایک اہم ملک ہے جو خلافت راشدہ کے دور ہی سے اسلامی امت کا حصہ رہا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کے اس ملک میں عربوں کے علاوہ کرد بھی آباد ہیں۔ عراق کی کل آبادی دو کروڑ سے کچھ زائد ہے۔ اس کی دولت کا اصل راز پٹرولیم ہے، اگرچہ دریائے دجلہ اور فرات کی وجہ سے اس میں زرعی علاقے بھی موجود ہیں۔ عراق کا موجودہ حکمران صدام حسین اپنی سرشت کے لحاظ سے اور اپنے تاریخی ریکارڈ کے حوالے سے ایک سخت گیر، ظالم، منتقم مزاج اور نہایت رعونت پسند آمر مطلق ہے۔ صدام حسین اس ملک پر ۱۶/جولائی ۱۹۷۹ سے اب تک تقریباً بلا شرکت غیرے حکومت کر رہا ہے۔ اس کے بہت سے ساتھی اس کے انتقام کا نشانہ بنے اور دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔ اپنے قریبی ساتھیوں کے علاوہ اپنے رشتے داروں میں سے بھی جس کسی کے بارے میں اسے خدشہ ہو کہ اس کی وفاداری مشکوک

ہے، اسے ٹھکانے لگانے میں وہ کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

صدام حسین کو زیادہ شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب مغربی دنیا کی اشیرباد سے اس نے ایران کے ساتھ جنگ شروع کی۔ بہ ظاہر اس جنگ کا آغاز شط العرب پر ایرانی اور عراقی دعووں کی وجہ سے ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے بہت طویل منصوبہ بندی کی گئی تھی اور امریکہ اور اس کے ادارے اس میں شامل تھے۔ جب امریکہ ایرانی انقلاب کے بعد ایران سے ذلیل و رسوا ہو کر نکلا اور اس کے دوست شاہ ایران کو بھی ایران سے نکال دیا گیا تو امریکہ نے ایران کے خلاف کچھ فوجی کارروائیاں کیں مگر وہ ناکام ہوئیں۔ اب امریکہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا اور وہ اس طرح کہ عراق کو تیار کر کے ایران پر چڑھا دیا جائے اور ایران کو اس کی سرکشی کا مزہ چکھا دیا جائے۔ دوسری طرف عراق کی قوت ایران کے مقابلے میں کمزور ہو گی تو اسرائیل کو اس سے بالواسطہ فائدہ پہنچے گا۔

۲۲/ستمبر۱۹۸۱ کو شروع ہونے والی عراق و ایران کی یہ جنگ وقفوں وقفوں سے تقریباً آٹھ سال جاری رہی اور اگست ۱۹۸۸ میں آخر کار یہ جنگ اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ایران بری طرح معاشی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ عراق کو بھی کافی نقصان اٹھانا پڑا مگر اس کے باوجود وہ اس لحاظ سے فائدے میں رہا کہ عرب دنیا کے تمام ممالک اس کی پشت پر تھے اور ان کی دولت اس پر واری جا رہی تھی۔ وہی صدام حسین جو کویت پر حملے کے بعد شیطان، ملحد، بعثی، دہشت گرد کہلایا، ایران عراق جنگ کے دوران صلاح الدین ثانی، مجاہد کبیر، بطل جلیل کے القاب سے یاد کیا جاتا رہا۔ صدام اس وقت بھی خطرناک عزائم رکھتا تھا اور اب بھی اس کے عزائم ویسے ہی ہیں، مگر اپنے مقاصد کی خاطر لوگوں کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ ایران کے مقابلے پر امریکی اشیرباد اسے مکمل طور پر حاصل تھی اس لیے اس عرصے میں عراق نے اپنے دفاعی سامان کے کارخانوں کو اچھی طرح منظم کر لیا۔ اسی زمانے میں یہ خیال پوری مغربی دنیا میں عام ہو گیا کہ عراق کے پاس کیمیاوی ہتھیار تیار کرنے کا وسیع نظام موجود ہے۔ نیز نیوکلیر قوت کے طور پر دنیا میں اپنا سکہ منوانے کا اس نے انتظام کر لیا ہے۔ اسی دوران ۷/جون ۱۹۸۱ جب ایران عراق جنگ زوروں پر تھی اسرائیلی جیٹ طیاروں نے بغداد کے قریب عراق کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ مگر اس پر امریکہ نے نہ تو اسرائیل کو کوئی وارننگ دی اور نہ اس غیر قانونی حملے پر مغربی دنیا میں کوئی احتجاج ہوا۔

ایران عراق جنگ کے بعد یہ سمجھا جا رہا تھا کہ عراق کے پاس ایسے میزائل اور ایسا اسلحہ موجود ہے کہ وہ کسی وقت بھی اسرائیل پر حملہ آور ہو جائے تو اسرائیل کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اب امریکہ نے ایک اور سازش تیار کی۔ اس سازش کے ذریعے امریکہ ایک طرف تو مشرق وسطیٰ میں اپنے پاؤں جمانے کے لیے مضبوط اڈے (base) کا متلاشی تھا اور دوسری طرف عراق کو باقی عرب دنیا سے کاٹ کر اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ امریکہ ہی کے اشارے اور اس کی منصوبہ

بندی کے تحت ۲/اگست ۱۹۹۰ کو عراقی فوجوں نے کویت پر حملہ کر دیا اور اس کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا جس کے نتیجے میں کویت کی حکومت جلاوطن ہو گئی۔ کویتی عوام اس ناگہانی حملے کے نتیجے میں مصائب کا شکار ہوئے۔

کویت پر عراق کا حملہ ایک بہت بڑا بحران تھا جس نے نہ صرف مشرق وسطیٰ کو بلکہ پوری اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ امریکہ نے اقوام متحدہ سے منظوری لے کر کئی ممالک کی فوج جمع کی اور عراق پر حملہ کیا۔ اس آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم کے نتیجے میں عراق کی فوج کو بری طرح پسپا ہونا پڑا۔ اسی وقت جب عراق کے خلاف پابندیاں (sanctions) عائد کرنے کا فیصلہ ہوا تو اس کا معاشی بائیکاٹ بھی کر دیا گیا۔ نتیجتاً عراق کے مظلوم عوام کو ایک بہت ہی خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔

اگر امریکہ کا ہدف صدام ہوتا تو ایسے حالات میں صدام کو راستے سے ہٹانا کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر امریکہ کا ہدف صدام نہیں' بلکہ تیل کے کنویں تھے جن پر قبضہ کرنے اور وہاں مستقل طور پر ڈیرے ڈالنے کے لیے صدام کا وجود ضروری تھا۔ چنانچہ صدام تو باقی رہا لیکن جو پابندیاں لگیں اس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں بچے' بوڑھے' مرد اور عورتیں موت کے گھاٹ اتر گئے۔ زندگی بچانے کی دوائیں بھی عراق کو حاصل نہ تھیں۔ اس پر تیل فروخت کرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی اور پوری دنیا نے اسے عملاً کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ لیبیا کی طرح عراق پر نو فلائی زون کی پابندی بھی لگا دی گئی۔ اس کے باوجود امریکہ کو یہ خیال رہا کہ عراق نے جنگی سازوسامان تیار کرنے کی فیکٹریاں خفیہ طور پر چلا رکھی ہیں اور ان سے وہ ایسا اسلحہ تیار کر رہا ہے جس سے اسرائیل کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے' چنانچہ امریکہ نے عراق کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ کسی وقت بھی عراق پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اور آخرکار برطانیہ کے ساتھ مل کر ۱۷/دسمبر ۱۹۹۸ کو حملہ کر دیا۔

اس دفعہ کے حملے اور ماضی کے حملے میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ اس بار امریکہ کے بہت سارے مضبوط اتحادی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور اس کے روایتی مخالف دھڑے نے بھی کھل کر اس کے عمل کی مذمت کی۔ فرانس نے امریکہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان حملوں کو بلاجواز قرار دیا۔ جرمنی اور اٹلی بھی جنگ میں شامل نہ ہوئے اور چین اور روس نے کھل کر ان حملوں کی مذمت کی۔ پوری دنیا میں رائے عامہ نے امریکہ کی مذمت کی ہے مگر مسلمان حکومتوں کی طرف سے کوئی مضبوط موقف سامنے نہیں آیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مرتبہ محض کویت کے اڈے استعمال کیے گئے اور سعودی عرب نے اپنے اڈے امریکہ کو استعمال کرنے سے روک دیا۔ ساتھ ہی اپنے ذرائع ابلاغ سے وہ مسلسل یہ نشر کرتے رہے کہ سعودی عرب کی سرزمین سے عراق پر کوئی حملہ نہیں ہوا' عراق کو سعودی عرب کے بارے میں معاندانہ سوچ ترک کر دینی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ متحدہ عرب امارات نے کھل کر امریکہ کی مذمت کی اور عراقی عوام کے ساتھ یک جہتی کا اعلان کیا۔ یہ ایک بڑی تبدیلی ہے مگر اس کے باوجود اسے کافی نہیں سمجھا جا سکتا۔

مسلمان ممالک خصوصاً پاکستان کو جو ایٹمی دھماکا کر چکا ہے' عراق کے عبرت ناک انجام سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ عراق نے ان معاہدوں پر دستخط کر رکھے ہیں جن پر پاکستان دستخط کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور غالباً ستمبر ۱۹۹۹ سے قبل عملاً دستخط ہو جائیں گے۔ ان دستخطوں کے بعد پاکستان کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا' یہ کوئی راز نہیں مگر مسلمان حکمرانوں کی بے حسی اور بزدلی نے امریکہ کو شیر بنا دیا ہے اور وہ اپنی من مانی کارروائیاں پورے دھڑلے سے کرتا چلا جا رہا ہے۔ تبدیلی اس لحاظ سے بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ اس مرتبہ خود یورپ اور امریکہ کے اندر امریکی اور یورپی باشندوں نے بھی ان حملوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے جب کہ سابقہ حملوں کے وقت پورا مغربی معاشرہ عراق کے خلاف ان حملوں کی پشت پر تھا۔ اگر مسلمان ممالک کوئی مضبوط موقف اپناتے اور ان حملوں کے مقابلے پر اپنی طرف سے نہ صرف یہ کہ عراق کی حمایت کرتے بلکہ امریکہ کو متنبہ کرتے کہ وہ اس اقدام کے نتیجے میں اس سے اپنے تعلقات منقطع کر سکتے ہیں تو شاید امریکہ کو ایسا حملہ کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ممالک کی قیادتیں کسی ایسے تدبر اور بصیرت سے محروم ہیں جس کے نتیجے میں کوئی فیصلہ کن انقلابی قدم اٹھایا جا سکے۔

دنیاے عرب میں تین ممالک ایسے تھے جن سے اسرائیل کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ ان میں سے ایک تو مصر تھا جو اپنی تعداد' فوج اور وسائل کے لحاظ سے اسرائیل کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ انور سادات کے دور میں (۶/اکتوبر ۱۹۷۳) اسرائیل کے مقابلے میں مصری فوج نے جو کامیابی حاصل کی وہ اس کی دلیل ہے کہ اگر مصر کسی وقت اسرائیل کا مقابلہ کرنا چاہے تو شاید اس کے مقابلے کی سکت رکھتا ہے۔ تاہم یہ المیہ ہے کہ مصر کو کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے ذریعے سے مکمل طور پر بے اثر کر دیا گیا۔ اسرائیل اور مصر کے سفارتی تعلقات قائم کروا دیے گئے۔ امریکہ نے مصر کے دانت نکال دیے ہیں اس لیے مصر سے اسرائیل کو اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ پھر مصر کو قرضوں کے جال میں بری طرح سے جکڑ لیا گیا ہے کہ وہ امریکہ کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں۔ دوسری قوت عراق ہو سکتا تھا جس کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ اس نے ایٹمی اور کیمیاوی ہتھیاروں کے میدان میں کافی پیش رفت کی ہے اور اس کے پاس مختلف قسم کے مہلک ہتھیار اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ یہ اسرائیل کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ عراق کو بھی پے در پے سازشوں کے ذریعے بے دست و پا کر دیا گیا ہے کہ اس سے بھی اب اسرائیل کو کوئی خطرہ نہیں۔ وسائل کے لحاظ سے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا روحانی مرکز ہونے کی حیثیت سے سعودی عرب کا بھی ایک ایسا مقام تھا کہ وہ بھی کسی وقت اگر کوئی انقلابی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں آ جاتا یا وہاں کوئی ایسی قیادت ابھر آتی جو انقلابی فیصلے کر سکتی تو اس سے بھی دنیا کے مسلمانوں کو حوصلہ ملتا اور وہ سعودی عرب کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس کے نتیجے میں اسرائیل کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا' مگر سعودی عرب کے جملہ امور و معاملات میں امریکہ اس قدر دخیل ہو چکا ہے کہ اب صرف سیاسی دباؤ ہی نہیں بلکہ عسکری دباؤ بھی واضح

طور پر نظر آ رہا ہے۔ عراق ہی کا ہوا دکھا کر امریکہ نے سعودی عرب کے دفاع کی ذمہ داری لے رکھی ہے جس کی بھاری قیمت سعودی عرب ادا کر رہا ہے اور شاید مدت تک کرتا رہے گا۔ امریکہ اب ایک جانب ان امیر ممالک کی معیشت پر قبضہ کر چکا ہے اور دوسری جانب جغرافیائی طور پر بھی ان کے اوپر اس کا تسلط اتنا مضبوط ہے کہ اس کو آسانی سے توڑا جانا ممکن نظر نہیں آتا۔

عراق پر آٹھ سال قبل لگنے والی تجارتی پابندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراق اپنی دولت صرف کر کے بھی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اب تک نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں ۹' ۱۰ ہزار عراقی باشندے جان کی بازی ہار بیٹھے ہیں۔ ان میں سے بعض خوراک کی کمی کی وجہ سے جو عراق دیگر ممالک سے درآمد کرتا تھا اور جو ان پابندیوں کی وجہ سے وہاں بروقت نہیں پہنچ سکی' موت کے گھاٹ اترے' جب کہ مرنے والوں کی ایک بڑی تعداد دوائیاں نہ ملنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔

کویت کے معروف ہفت روزہ المجتمع نے ۴/جنوری ۱۹۹۸ کی اشاعت میں عراق کے آمر صدام حسین کے خلاف اپنے اداریے میں اس تازہ صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سارا ڈراما امریکہ اور صدام حسین کی ملی بھگت سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسلامی تحریکوں نے عراق کی طرف سے کویت پر حملے کے دنوں میں امریکہ کی مخالفت کا جو موقف اپنایا تھا اسے صدام حسین کی حمایت قرار دیا گیا مگر اب یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ امریکہ اور صدام دونوں ہی مجرم تھے۔

المجتمع نے عراقی عوام پر توڑے جانے والے مظالم پر اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ عراق کی معیشت مکمل طور پر تباہ ہو گئی ہے۔ اس موقر عربی مجلے کے مطابق صورت حال یہ ہے: ۱۹۷۹ میں عراق میں فی کس آمدنی ۴۲۰۰ ڈالر تھی جب کہ ۱۹۹۸ میں گھٹ کر ۵۰۰ ڈالر فی کس آمدنی رہ گئی ہے اور یہ کمی مسلسل جاری ہے۔ مجلے کے مطابق ضروریات زندگی اور سہولیات کی درآمد کی صورت حال بھی ازحد تشویش ناک ہے۔ ۱۹۷۹ میں درآمدات کی اوسط سالانہ ۶۰۰ ڈالر فی کس تھی جو اس وقت کم ہو کر ۲۰ ڈالر فی کس رہ گئی ہے' بعض غریب ممالک سے بھی کم۔ اس کی اصل وجہ معاشی بدحالی سے زیادہ تجارتی و معاشی پابندیاں ہیں۔ عراق دیگر عرب ممالک کی طرح قرضوں کے بوجھ تلے بھی دب گیا ہے۔ عراق کی بیرونی تجارت کا حجم ۱۹۸۷ میں ۹۷/ارب ڈالر تھا جو اب کم ہو کر صرف ۳۰۰ ملین ڈالر رہ گیا ہے۔ مجلے کے مطابق غیر ملکی قرضوں کا بوجھ ۷۰/ارب ڈالر ہے جب کہ کویتی جنگ کے نتیجے میں عراق پر ۲۰۰/ارب ڈالر کا تاوان الگ ہے۔

مغربی دنیا میں اگر کوئی جانور بھی ظلم کا شکار ہو جائے تو تہلکہ مچ جاتا ہے اور مختلف قسم کی تنظیمیں میدان میں نکل آتی ہیں اور احتجاج کا ایک لامتناہی سلسلہ ظلم کے خلاف مظلوم کی حمایت کے نام پر چلتا رہتا ہے۔ مگر یہاں عجیب بات ہے کہ نو دس ہزار انسانی جانیں ایک ناروا ظلم کے نتیجے میں معاشی پابندیوں سے

اور ہزاروں افراد مغربی افواج کے دونوں حملوں میں لقمہ اجل بنے، مگر اس پر مغربی دنیا میں کہیں بھی صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی۔ یہ مغرب کے دہرے معیار ہیں جن کی وجہ سے مغرب، دنیا کی قیادت کے منصب سے محروم کیے جانے کے قابل ہے اور قدرت کے فیصلے ایسے حالات میں یہی ہوا کرتے ہیں کہ وہ ایسی قوموں اور ایسے افراد کو قیادت سے ہٹا دیا کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ صدر بل کلنٹن کی جانب سے کیے جانے والے ان حملوں کو مغربی دنیا میں اس جنسی اسکینڈل کے تناظر میں بھی دیکھا گیا ہے جس میں صدر کا مواخذہ کیے جانے کا امکان تھا۔ ممکن ہے کہ صدر بل کلنٹن نے امریکی رائے عامہ کی توجہ ہٹانے کے لیے عراق پر حملہ کیا ہو۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ امریکی معاشرہ جس دیوالیہ پن کا شکار ہو گیا ہے اس سے قطعاً یہ امید نہیں کہ صدر بل کلنٹن کا کوئی مواخذہ ہو جائے بلکہ یہ بات انتہائی تشویش ناک ہے کہ دنیا کے بہ ظاہر اس سب سے طاقت ور ملک کی رائے عامہ اپنے سربراہ مملکت کے اس غیر اخلاقی ریکارڈ کے باوجود اسے زیادہ پسند کرنے لگی ہے۔ تازہ ترین جائزوں کے مطابق صدر کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ صدر بل کلنٹن ایک ایسا تاثر چھوڑ کر جانا چاہتا ہے کہ امریکی رائے عامہ اسے اسرائیل کا سرپرست، محافظ اور دوست شمار کرنے لگے۔ اس کے ساتھ کلنٹن بھی بش کی طرح ایک جنگ جو اور بزعم خویش "بہادر" صدر کی حیثیت سے وہائٹ ہاؤس سے رخصت ہونا چاہتا ہے مگر غیر جانب دار مورخ جب حقائق کا تجزیہ کرے گا تو کلنٹن کو جنسی بلے اور مکار لومڑ سے زیادہ کسی خطاب کا مستحق نہ گردانے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس آپریشن کو جو نام دیا گیا ہے وہ بھی صحرائی لومڑ ہے جو اسم بامسمّٰی ہے۔

اس طرح کے مواقع پر دنیا کا جو منظرنامہ سامنے آتا ہے وہ مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اتنی بڑی تعداد اور اتنے وسائل کے مالک ہونے کے باوجود، اتنے بے اثر کیوں ہیں۔ یقیناً اس لیے کہ امت کی طاقت مجتمع نہیں ہے اور ہمارے حکمرانوں کو امت کے مفادات سے زیادہ اپنے مفادات عزیز ہیں۔ دنیا کا نقشہ اس وقت تبدیل ہو گا جب امت مسلمہ میں اتنی بیداری اور شعور ہو کہ وہ اپنے ملک کا اقتدار ان ہی لوگوں کے سپرد کریں جنھیں امت کا مفاد عزیز تر ہو۔

ڈاکٹر محبوب الحق کے بارے میں

پروفیسر خورشید احمد

پاکستان کے چوٹی کے ماہر معاشیات اور ماہر منصوبہ بندی ڈاکٹر محبوب الحق (وفات ۱۶ر جولائی ۱۹۹۸) مغرب میں بھی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات تمام دنیا اور خصوصاً پاکستان کے علمی حلقوں کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ یہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں اقرا نیشنل ٹاسک فورس کے چیئرمین کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی وسائل کی ترقی (Human Resource Development) کے لیے اپنے طور پر کوشاں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اچھے کاموں کو قبول فرمائے اور اس کا اجر انھیں عطا فرمائے اور ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائے۔

ڈاکٹر محبوب الحق ۲۴ر فروری ۱۹۳۴ کو ریاست جموں و کشمیر کے موسم گرما کے صدر مقام جموں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماسٹر عبدالعزیز یہاں پڑھاتے تھے۔ ماسٹر صاحب کے تین بیٹوں میں محبوب الحق سب سے چھوٹے لیکن سب سے ممتاز تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جموں میں حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کا خاندان قیام پاکستان کے موقع پر آگ و خون کا دریا پار کر کے پاکستان آیا۔ ماسٹر عبدالعزیز نے گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں مسلم ہائی اسکول قائم کیا۔ وہ اس اسکول کے پرنسپل رہے اور ساری زندگی تعلیم کے ساتھ گہری وابستگی میں گزاری۔ مجھے ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ان سے ملنے کا موقع ملا جب کہ وہ اپنے گھر سیکٹر ایف۔۷ کے قریب ایک مسجد کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں تھے۔

ڈاکٹر محبوب الحق کے والد بہت سادہ اور نہایت وضع دار انسان اور بہت اچھے استاد تھے۔ ڈاکٹر محبوب الحق کی تعلیمی کارکردگی بچپن سے ہی بہت اچھی تھی۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کیا، اور کیمبرج اور ییل (Yale) کے لیے اسکالرشپ حاصل کیا، جہاں انھوں نے معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے سب سے پہلے سٹیٹ بنک آف پاکستان میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد میں وہ پلاننگ کمیشن میں چیف اکانومسٹ مقرر ہوئے جہاں انھوں نے بارہ سال (۱۹۵۷-۷۰) خدمات انجام دیں۔ اس منصب پر وہ معاشیات دانوں اور منصوبہ بندی کے ہارورڈ گروپ کے

بہت قریب ہو گئے۔ اس کے علاوہ ان کے تعلقات ورلڈ بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کے افسران سے استوار ہوئے۔

پلاننگ کمیشن سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۷۰ میں وہ ورلڈ بنک کے شعبہ پالیسی پلاننگ کے ساتھ منسلک ہو گئے اور بہت اہم حیثیت حاصل کر لی۔ وہ ورلڈ بنک کے صدر رابرٹ میکنامارا سے بہت قریب تھے۔ انھوں نے ۱۹۸۲ میں ورلڈ بنک کے نئے سربراہ سے مایوس ہو کر بنک سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ڈاکٹر محبوب الحق، جنرل ضیاء الحق کے عہد میں ۱۹۸۲ میں پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کے طور پر پاکستان واپس آ گئے۔ وہ وفاقی وزیر کے برابر عہدے اور صدر پاکستان کے ساتھ راست رابطے کے خواہش مند تھے جب کہ اس وقت کے وزیر خزانہ غلام اسحاق خان اس کے مخالف تھے۔ وہ چیئرمین پلاننگ کمیشن بن گئے اور انھیں ان کے تحت کام کرنا پڑا۔ جب غلام اسحاق خان چیئرمین سینیٹ بنے (۸۷-۱۹۸۵) تو ڈاکٹر محبوب الحق وفاقی وزیر منصوبہ بندی کے عہدے پر پہنچ گئے۔ محمد خان جونیجو کے دور میں ان کے وفاقی وزیر خزانہ بننے کے خواب کی تکمیل ہو گئی۔ ۱۹۸۷ میں جناب جونیجو نے اپنی کابینہ میں وسیع پیمانے پر رد و بدل کرتے ہوئے ڈاکٹر محبوب الحق کی جگہ محمد یٰسین خان وٹو کو وزیر خزانہ بنا دیا۔ ڈاکٹر محبوب الحق کو اس بات پر بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے کابینہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس موقع پر جنرل ضیاء الحق صاحب نے ان کو ایسا کرنے سے روکا۔ جنرل ضیاء الحق کی وفات کے بعد وہ واپس امریکہ چلے گئے اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) سے منسلک ہو گئے۔ یہاں انھوں نے انسانی وسائل کی ترقی کے اشاریے اور اس موضوع سے متعلق دوسری رپورٹس کی تیاری میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ آخرکار وہ پاکستان لوٹ آئے اور ہیومن ڈویلپمنٹ سنٹر اسلام آباد کے سربراہ بن گئے۔ یہ ایک ایسی غیر سرکاری تنظیم (NGO) تھی جس کے روابط بین الاقوامی اداروں سے تھے۔

ڈاکٹر محبوب الحق سے میرا پہلا تعارف ساٹھ کے عشرے میں اس وقت ہوا جب وہ پلاننگ کمیشن میں چیف اکانومسٹ تھے اور میں کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ معاشیات میں پڑھا رہا تھا۔ وہ ایک ذہین اور بہت اچھی یادداشت کے علاوہ تحریر و تقریر کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا اپنا ایک خاص انداز تھا، لیکن وہ معاشی پیش منظر پر چھائے ہوئے خیالات کو آگے بڑھانے پر مجبور رہے۔

ستر کے عشرے میں کئی مواقع پر ہمیں مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں کے موقع پر اکٹھے ملنے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہا۔ البتہ ان کے میرے درمیان زیادہ قریبی تعلقات اس وقت استوار ہوئے جب ۸۸-۱۹۸۵ کے تین سال کے عرصے میں وہ سینیٹ میں بطور وفاقی وزیر اور میں اپوزیشن کی طرف سے بولنے والا تھا۔ اس عرصے کے دوران میں ان کی معاملہ فہمی، صلح جوئی اور قائل کرنے کی

صلاحیتوں سے آگاہ ہوا۔ بہت سے معاشی' سماجی اور نظریاتی مسائل پر' جن سے ملک دوچار ہے' ہماری سوچ بعض اوقات یکساں اور بعض اوقات مختلف ہوتی تھی۔ ہماری گفتگو ہمیشہ اچھے ماحول میں ہوتی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ باوجود اپنی پوری کوشش کے' میں ان کو اسلامی معاشیات کی طرف مائل کرنے اور ان کا ذہن تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ انھوں نے کئی دفعہ وعدہ کیا کہ وہ اسلامی معاشیات پر مطالعہ بھی کریں گے اور اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کریں گے۔ تاہم وہ اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں غربت کے خاتمے اور سماجی انصاف کے لیے مشترکہ کوشش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر محبوب الحق معاشیات کے نو کلاسیکی مکتبہ فکر کے زبردست حامی تھے۔ اسی پر انھوں نے کیمبرج اور ییل (Yale) کی جامعات میں عبور حاصل کیا تھا اور دنیا کے معاشی حقائق کے تناظر میں وہ اسی کے حوالے سے نئی نئی جہتوں کی تلاش میں تھے۔ البتہ انھوں نے ہارورڈ اور واشنگٹن مکتبہ فکر کی طرف سے بنائی گئی ترقیاتی حکمت عملیوں کو پورا پورا اختیار کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود بعد کے دور میں وہ مروجہ ترقیاتی حکمت عملیوں اور منڈی کی میکانیت سے غیر مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز' منڈی کی معیشت' سرمایہ دارانہ آزادی' معاشیات میں اخلاقیات کے بارے میں غیر جانب داری اور سرمایہ پر مبنی ترقیاتی حکمت عملیوں پر اپنے پختہ یقین کے ساتھ کیا۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف' "معاشی منصوبہ بندی کی حکمت عملی" (The Strategy of Economic Planning) تھی جسے آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نیویارک نے ۱۹۶۳ میں شائع کیا۔ یہ کتاب بہت خوب صورت پیرائے میں اور بہت ہی مدلل انداز میں لکھی گئی تھی جس میں خالصتاً سرمایہ دارانہ طرز پر ترقی کی حکمت عملی کو واضح کیا گیا تھا۔ اس میں خام پیداوار میں اضافے کو ترقی کی بنیاد قرار دیا گیا' جب کہ تقسیم دولت اور فلاح عامہ کے پہلوؤں کو نظرانداز کیا گیا اور یہ توقع ظاہر کی گئی کہ اس کے نتیجے میں آخرکار بہت سے لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جائے گی۔ درحقیقت انھوں نے معاشی ناہمواریوں کے حق میں دلائل دیے کیونکہ اس کے نتیجے میں ترقی کی رفتار کو بہت تیز کیا جا سکتا تھا۔ ان کے الفاظ میں: "تاہم آمدنیوں میں تفاوت کا ایک عملی جواز موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں صرف چند لوگوں کے صرف میں اضافہ نہ ہو' سب کی آمدنیوں میں اضافہ ہو جائے۔ مطلوبہ معاشی مساوات کا راستہ ابتدا میں ناگزیر معاشی ناہمواریوں سے گزر کر جاتا ہے" (معاشی ترقی کی حکمت عملی' ص ۳)۔ دوسری بات جس کی وہ گرفت میں رہے' وہ بیرونی امداد اور قرضوں پر مبنی ترقیاتی حکمت عملی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ بیرونی امداد پر مبنی ترقی کے نتیجے میں آخرکار خود انحصاری حاصل ہو گی۔ اس کے لیے انھوں نے بھرپور دلائل دیے' لیکن یہ معجزے کبھی رونما نہ ہوئے۔ یعنی ناہمواریوں کے نتیجے میں معاشی مساوات اور بیرونی امداد کے نتیجے میں خود انحصاری کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ اور اگر تاریخ کوئی راہ نما ہے' تو ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ پہلی کتاب

کی طرح ان کی دوسری اہم کتاب، "غربت کے اسباب" (The Poverty Creation) تھی جو ۱۹۷۶ء میں کولمبیا یونی ورسٹی پریس نے شائع کی۔ اس کتاب میں بھی وہ بیرونی امداد اور قرضوں پر مبنی ترقیاتی حکمت عملی کے تصور سے جان نہ چھڑا سکے۔

ان کے ناقدین کا خیال ہے کہ جب ورلڈ بنک کے صدر رابرٹ میکنمارا نے پانچویں اور چھٹی دہائی میں پیش کی گئی ترقیاتی حکمت عملیوں کی کامیابی کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کیا اور غربت کو بنیادی مسئلہ قرار دیا تو اس کے بعد ڈاکٹر محبوب الحق نے دوسرے ترقیاتی معیشت دانوں کی طرح غربت کی حد فاصل (Poverty Curtain) کی بات کرنا شروع کر دی۔

ڈاکٹر محبوب الحق ایک گم نام معیشت دان کے پردے سے نکل کر قومی سطح پر اس وقت نمودار ہوئے جب ایوب خان کے دور حکومت کے آخری ایام میں انھوں نے بائیس خاندانوں کی لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ بندی کمیشن اور پاکستان کی وفاقی حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں افراد کے درمیان اور بین العلاقائی آمدنیوں میں تفاوت پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں معاشرے اور ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ یہ ڈاکٹر محبوب الحق اور ان کے ساتھیوں کی، جو حکومت اور ہارورڈ مشاورتی گروپ میں شامل تھے، دو دہائیوں پر مشتمل پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۸ کے درمیان منصوبہ بندی کمیشن کے چیئرمین اور وفاقی وزیر خزانہ و منصوبہ بندی کی طرف سے پیش کی گئی پالیسیاں بھی اس سے مختلف نہ تھیں۔ درحقیقت کالے دھن کو سفید کرنے اور نئے معاشی قزاقوں کو سامنے لانے کے نتیجے میں ایسا ہوا۔ یہ طبقات قیام پاکستان کے وقت کے سرمایہ داروں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ برے تھے کیونکہ ان کی تو پاکستان سے، اس کے عوام اور نظریے سے وابستگی تھی اور انھوں نے پرخطر حالات میں دولت کمائی تھی، صرف بنک کے قرضوں اور بیرونی قرضوں کے سہارے پر ایسا نہ کیا تھا۔ اگر بائیس خاندانوں کی کہانی تیار کرنے اور پھیلانے کے بارے میں حقائق سے واقف ایک سینئر بیوروکریٹ کی ان باتوں پر یقین کیا جائے جو انھوں نے منصوبہ بندی کمیشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے میرے ساتھ کام کرتے ہوئے بتائیں تو حقیقی تصویر کسی بھی طرح قابل رشک نہ تھی۔

ستر کی دہائی میں ڈاکٹر محبوب الحق "ریسائیکلنگ تھیسس" (recycling thesis) کے فروغ میں بہت سرگرم ہو گئے۔ یہ وہ خیال تھا جو مغرب نے طاقت کا توازن تیل پیدا کرنے والے ممالک کی طرف منتقل ہونے کے بعد پیش کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ریسائیکلنگ نہ ہوئی تو اس سے دنیا کی معیشتوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یہ حقیقت مدنظر رہے کہ ریسائیکلنگ کا بڑا حصہ تیل پیدا کرنے والے ممالک کی طرف ناقابل استعمال اسلحے کی درآمد اور ان کے مالیاتی وسائل کے مغربی ممالک کے بنکوں کی طرف بہاؤ پر مشتمل تھا،

جہاں ستر کی دہائی میں افراط زر کی شرح، سود کی شرح سے زائد تھی جس کے نتیجے میں ان ڈیپازٹس کی حقیقی قدر میں سالانہ تین فی صد کمی ہو رہی تھی۔

۱۹۸۲ تا ۱۹۸۸ وہ پاکستان کے منصوبہ بندی، خزانہ اور تجارت کے وزیر رہے۔ اس عرصے میں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ساتھ ان کی 'فتوحات' ملک پر قرضوں کا بوجھ ۱۹۸۲ کے ۱۱.۷ ارب ڈالر سے ۱۹۸۸ میں ۱۹.۹ ارب ڈالر تک بڑھانے پر منتج ہوئیں (اب ۳۲ ارب ڈالر ہے)۔ انھوں نے ملک میں "ترقیاتی اسکیم" کا آغاز کیا جس کے تحت سینیٹروں اور اسمبلی کے ممبران کو یا ان کے ذریعے ان کے حلقہ انتخاب میں ترقیاتی کاموں کے لیے رقومات دی گئیں۔ اس اسکیم نے منتخب نمایندوں کی سطح پر سیاسی کرپشن کے دروازے چوپٹ کھول دیے۔ ملک آج تک اس کی سزا بھگت رہا ہے۔

ڈاکٹر محبوب الحق کی انسانی عنصر (human factor) کو از سرنو اہمیت دینے، اور انسانی وسائل کی ترقی کے لیے کوششیں مثبت ہیں، لیکن انسانی ترقی کا ان کا تصوراتی خاکہ تعلیم اور صحت و صفائی سے آگے نہیں جاتا۔ حقیقی انسانی ترقی کے بنیادی سوال اور سماجی انصاف کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا۔ انسانی وسائل کا اشاریہ (Human Resource Index) ایک اور فیشن بن سکتا ہے۔ اور یہ اس وقت اور سنگین ہو جاتا ہے جب اسے "قومی سلامتی" کے بجائے "افراد کی سلامتی" کے حوالے سے دیکھا جائے جیسے کہ افراد کی سلامتی، قومی سلامتی کے بغیر بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ انھیں اور دوسرے معیشت دانوں کو مغربی ممالک اور پڑوسی ملک بھارت کے فوجی اور سیاسی عزائم پر کوئی خاص تشویش نہ تھی۔ ان کثیر الملکی کارپوریشنوں کی طرف سے پیدا کی گئی ناہمواریوں اور غیر منصفانہ اقدامات پر بھی وہ کوئی پریشانی محسوس نہ کرتے تھے جو دنیا کی ۸۲ فی صد تجارت پر قابض ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور سٹہ بازوں کے بارے میں جو عالمی منڈیوں کو اپنی مرضی پر چلاتے ہیں، انھوں نے کچھ نہ کہا۔ "آزاد روی" اور عالم گیریت کے پورے کھیل پر جس کے گرد نئے نو آبادیاتی نظام کا تانا بانا بنا جا رہا ہے، انھیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر محبوب الحق جنوبی ایشیا میں بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات کے ناقد تھے۔ وہ اس انتہا تک پہنچے کہ ۱۹۹۶ میں راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے تحت دہلی میں ہونے والے سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان دیوار برلن کو ختم ہونا چاہیے۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ بھول گئے کہ دیوار برلن ایک ملک یعنی جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار تھی۔ جب کہ پاکستان اور بھارت دو آزاد ممالک ہیں جن کے درمیان بین الاقوامی سرحد ہے جو ہندستان کے مسلمانوں کی تاریخی جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ ان کی کشمیر سے لاتعلقی کا اظہار ان کے "بھارتی مقبوضہ کشمیر" اور "پاکستانی مقبوضہ کشمیر" کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کا کشمیر کو اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں دینے کا بیان بھی ایسی فروگزاشت

تھیں جو ہم جیسے بہت سے لوگوں کے لیے تکلیف و رنج کا باعث ہوئیں۔ خواہ کوئی' اس بات سے اتفاق نہ کرے کہ ان کا یہ نقطہ نظر امریکہ کو کشمیر میں قدم جمانے کا موقع دینے کے مترادف تھا (ملاحظہ ہو' الطاف گوہر صاحب کا مضمون Dr. Mahbubul Haq back in the Ring' دی نیشن ۱۲ر فروری ۱۹۹۶ اور Please Haq Face Facts حوالہ الطاف گوہر کی کتاب' Thoughts and After Thoughts' ص ۴۲۹-۴۳۰)۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب الحق جیسی ممتاز شخصیت نے ایک نازک قومی مسئلے پر ٹھوکر کھائی۔

ڈاکٹر محبوب الحق ایک بڑے آدمی تھے' وہ ایک ممتاز معیشت دان اور روشن خیال مفکر تھے۔ لیکن ان کی فکر میں روشن پہلوؤں اور حسین خوابوں کے ساتھ ساتھ چند تاریک پہلو بھی تھے اور کچھ پرفریب خیال بھی۔ لیکن اس ناکمل دنیا میں کون مکمل اور خامیوں سے پاک ہے۔ اب وہ اپنے رب کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت و برکت سے نوازے۔ آمین (ترجمہ: میاں محمد اکرم' ماہنامہ امپیکٹ' لندن' نومبر ۹۸)

---

3 آپ کا ردعمل کیسا ہو؟

جب آپ کے ساتھ یا آپ کے ماتحت کام کرنے والے آپ کو اپنے کام کے بارے میں بتاتے ہیں تو آپ کا ردعمل ان کی مستقبل کی کارکردگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔

آپ کے پاس چار متبادل صورتیں ہیں۔ آپ موقع و محل کے اعتبار سے ان میں سے کوئی ایک یا ان کی کوئی مشترک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

خاموشی اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ صورت حال فی الوقت جوں کی توں رہے۔ اس سے کام کرنے والے کا آپ پر اعتماد کمزور پڑ سکتا ہے' اس کی کارکردگی خراب ہو سکتی ہے ○

تنقید آپ توقع اور معیار سے کم تر امور کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ ان کا اعادہ نہ ہو۔ اس سے کام کرنے والے کے ساتھ تعلقات پر اچھا اثر نہیں پڑتا لیکن اسے آپ کی مرضی وضاحت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کا اعتماد بے جا تنقید سے مجروح ہو سکتا ہے ○

مشورہ آپ نتائج پر توجہ مرکوز کراتے ہیں اور اسے مستقبل میں اصلاح کے لیے مفید مشورے دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کا اعتماد بڑھتا ہے' کارکردگی بھی بہتر ہو سکتی ہے اور تعلقات پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ رویے اور کردار میں تبدیلی کے لیے یہ بہتر راستہ ہے ○

تعاون آپ کام کا جائزہ لیتے ہوئے عملی تعاون کی پیش کش کرتے ہیں۔ مطلوبہ نتائج اور معیار کے حصول کے لیے مثبت طور پر شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح اس کا اعتماد بڑھتا ہے۔ کارکردگی بھی یقینی طور پر بہتر ہوتی ہے اور آیندہ کے لیے تحریک بھی ملتی ہے ○

آپ کا ردعمل کس موقع پر کیا ہو' اس کا فیصلہ آپ خود کریں

رسائل و مسائل

سائنسی تحقیق: دینی یا دنیوی کام

سوال: میں ایک مقامی ادارے میں انجینئر ہوں۔ اپنے شعبے میں تخصص (specialization) کیا ہے۔ یہاں پر اعلیٰ درجے کی تحقیق ہوتی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں دن کا بڑا حصہ صرف اور صرف اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت اور سونے میں گزار دیتا ہوں اور باقی حصہ نماز اور گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ۔ بچپن سے ہی تحریک سے وابستہ ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ میں بھی مذہب کو زیادہ سے زیادہ وقت دوں اور زیادہ مطالعہ کروں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے اپنی ساری توانائیاں صرف اور صرف دنیا کے لیے کھپا رکھی ہیں۔ جتنی فکر، جتنی لگن اور جتنا شوق مجھے اپنے پیشے سے ہے، اتنا مذہب سے ہرگز نہیں۔ جب سے یہ فکر لاحق ہوئی ہے، میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پا رہا۔ براہ کرم درج ذیل حوالوں سے میری رہنمائی فرمایئے:

۱۔ اسلام میں اعلیٰ تحقیق بالخصوص سائنسی مضامین کے بارے میں کیا احکامات ہیں جب کہ موجودہ دور میں تخصص کی بہت اہمیت ہے اور ایک فرد کو اپنے شعبے میں بہت وقت دینا پڑتا ہے۔

۲۔ خالص سائنسی پیشے کو مذہبی نقطہ نگاہ سے کیسے ہیں؟ جب کہ یہ خالص دنیاوی ہوں؟

جواب: اسلام میں اعلیٰ تحقیق (بالخصوص سائنسی مضامین میں) کے حوالے سے آپ کے سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید آپ بھی اسلام کو بڑی حد تک ایک "مذہب" سمجھتے ہیں۔ مغرب میں یہ عام تصور پایا جاتا ہے کہ مذہب عبادت، ذاتی اور روحانی ترقی یا چند مخصوص وظائف کے ادا کرنے کا نام ہے اور اس کا کوئی براہ راست تعلق ایک فرد کے فنی یا پیشہ ورانہ معاملات سے نہیں ہے۔ اس تصور نے مختلف ذرائع سے جن میں تعلیم، ثقافت اور ذرائع ابلاغ شامل ہیں، یہ باور کرا دیا ہے کہ مغربی عیسائیت کی طرح اسلام بھی ایک مذہب ہے جو ذاتی نجات اور سکون تو فراہم کرتا ہے لیکن فنی معاملات کو اہل فن پر چھوڑ دیتا ہے۔

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن کریم نے جگہ جگہ اہل ایمان کو کائنات پر غور کرنے پر ابھارا ہے تاکہ وہ موجودات پر غور اور تحقیق و تجربے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا اندازہ کر سکیں اور کائنات میں موجود ذرائع کو انسانی معاشرے کی فلاح و ترقی کے لیے ذمہ داری کے ساتھ استعمال کر سکیں۔

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے: "کچھ شک نہیں اہل ایمان کے لیے اس میں نشانی ہے" (العنکبوت ۲۹:۴۴)۔ یہی مفہوم سورہ فاطر ۳۵:۴۱' سورہ المومن ۴۰:۶۴' سورہ الزخرف ۴۳:۹۔۱۰ اور سورہ الجاثیہ ۴۵:۳ میں ملتے جلتے الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا انسان کو متوجہ کرنا ہے کہ وہ کائنات اور اس کی موجودات پر غور و تحقیق کرنے کے بعد نہ صرف خالق کائنات بلکہ خود اپنے بارے میں طے کرے کہ وہ کس قسم کی زندگی گزارے' شکر کی یا کفران نعمت کی۔ چنانچہ فرمایا گیا: "کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اس کو کیوں کر بنایا اور سجایا اور اس میں کہیں شگاف تک نہیں" (ق ۵۰:۶)۔ ظاہر ہے یہ اور اس مضمون کی دیگر آیات' (الانبیا ۲۱:۳۳' الملک ۶۷:۳-۴' النزعت ۷۹: ۲۷-۲۹) ایک متلاشی حق کو بار بار اس امر پر ابھارتی ہیں کہ وہ آنکھیں کھول کر آسمان کو' آفاق کو' کائنات کو' اپنے نفس کو اور خصوصاً خلا (space) کو اپنی تحقیق کا مرکز بنائے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے لیے وہ ایجادات کرے جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کائنات کے اسرار و رموز اس کے سامنے کھولنے میں مددگار ہوں۔

جب قرآن پاک فرماتا ہے کہ: "کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی ہوا میں گھرے ہوئے (اڑتے رہتے) ہیں' ان کو اللہ ہی تھامے رکھتا ہے۔ ایمان والوں کے لیے اس میں نشانیاں ہیں" (النحل ۱۶:۷۹' مزید الملک ۶۷:۱۹)' تو اس کا واضح اشارہ اس طرف ہے کہ انسان طیارہ سازی (aeronautics) کے حوالے سے تحقیق و تجربہ کرے کہ اگر پرندے فضا میں یوں سفر کر سکتے ہیں تو بی۔ ۵۲ کیوں سفر نہیں کر سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ماضی میں جب اہل ایمان نے قرآن پر غور کیا اور اس میں اپنے شعبے اور فن کے حوالے سے ہدایات تلاش کیں تو وہ نہ صرف تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ و ادب میں بلکہ فضا اور کائنات کے حوالے سے نئے نئے تجربات کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فضا میں پرواز کے سلسلے میں بھی مسلمانوں نے عباسی دور حکومت میں تجربات کیے تھے۔

قرآن کریم نہروں اور سمندروں کے حوالے سے نہ صرف یہ بات سمجھاتا ہے کہ ان میں انسان کے لیے بہترین غذا رکھ دی گئی ہے: "اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمھارے اختیار میں دیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ' اور اس سے زیور (موتی وغیرہ) نکالو جسے تم پہنتے ہو' اور تم دیکھتے ہو کہ یہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور اس لیے بھی کہ تم اللہ کے فضل سے (معاش) تلاش کرو تاکہ اس کا شکر کرو" (النحل ۱۶:۱۴۔ مزید دیکھیے بنی اسرائیل ۱۷:۷۰' فاطر ۳۵:۱۲' ۲۷ الرحمٰن ۵۵:۲۱' ۲۴' ابراھیم ۱۴:۳۲' الروم ۳۰:۴۶)' بلکہ ان کا تجارتی استعمال بطور بحری شاہراہوں کے بیان فرماتا ہے تاکہ نقل و حمل کے وسائل ایجاد کیے جائیں اور محفوظ سفر اور تجارتی سامان کی ترسیل کے لیے اس کا استعمال کیا جا سکے۔ "اور نہریں اور رستے بنا دیے تاکہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جا سکو" (النحل ۱۶:۱۵)۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ آج جو صنعتی ترقی ہے اس میں فولاد یا لوہے کا بنیادی کردار ہے۔ قرآن کریم جہاں

جگہ جگہ آسمان اور پانی کی طرف متوجہ کرتا ہے وہاں فولاد کی طرف بھی متوجہ کر کے سمجھاتا ہے کہ تحقیق کے ذریعے اس کے استعمال معلوم کریں۔ آج کے معاشی میدان سے اگر صرف ایک عنصر یعنی فولاد یا لوہے کو نکال دیا جائے تو تمام کاروبار حیات ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ آخر فیکٹریوں کی مشینیں، مشینوں کو لانے والے ٹرک، ریل گاڑیاں، بحری جہاز اور ہوائی جہاز، سب لوہے اور فولاد ہی کے تو مرہون منت ہیں۔ "اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطرہ بھی شدید ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں" (الحدید ۵۷:۲۵)۔ گویا دھاتوں اور معدنیات کے حوالے سے متوجہ کرتے ہوئے ان افراد کو جو اس میدان میں تخصص پیدا کرنا چاہتے ہوں، دعوت دی گئی کہ وہ آگے بڑھیں اور اللہ کی پیدا کی ہوئی اس نعمت کو نہ صرف دفاعی مصنوعات کے لیے جن میں انسانیت کے لیے خطرے کا ذکر کیا گیا بلکہ دیگر اہم معاشی فوائد کے لیے بھی استعمال کریں۔ غور کیا جائے تو کپڑے سینے کی سوئی ہو یا انجکشن کی سوئی، لکڑی یا دیوار میں لگنے والی کیل ہو یا بجلی کے بڑے بڑے کھمبے، میلوں لمبے پل ہوں یا کاغذ کو یکجا کرنے والا اسٹیپلر، لوہا کہاں نہیں ہے۔ حد یہ کہ انسانی غذا میں بھی تناسب پیدا کرنے اور خون کی پیداوار بڑھانے میں آئرن (فولاد) کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ تمام پہلو اور ان سے وابستہ تخصص کو زیر بحث لا کر گویا قرآن نے ہمیں پیغام دیا ہے کہ ہم سائنسی تحقیق و ترقی میں کلاں (Macro) اور خورد (Micro) سطح پر تحقیق و تجربہ کو اختیار کریں اور اللہ کے شاکر بندے بنیں۔

انبیا کرام کے حوالے سے بھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے بعض اپنے اپنے فن کے ماہرین تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی جہاز سازی کی مہارت، حضرت داؤد علیہ السلام کی آہن گری، حضرت یوسف علیہ السلام کا مالیاتی معاملات میں ماہر ہونا، سامنے کی مثالیں ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ قرآن نے خود ایمان کے حوالے سے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ انسان میں نفسیاتی طور پر تخصص اور مہارت و کمال کی صفات پیدا کرنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ اسلام، ایمان، احسان اور تقویٰ اس تدریجی ترقیاتی عمل کی نشان دہی کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کو مالک و آقا تسلیم کرنے کے بعد ایمان کمال کے مدارج سے گزرے اور احسان کی کیفیت اور تقویٰ کی صفت و طرز کو اختیار کر لے اور محض روایتی شہادت تک محدود نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث انتہائی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کرتی ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ: "اگر تمھیں جانور کو ذبح کرنا ہو تو انتہائی تیز آلے سے ذبح کرو"۔ غور کیجیے کہ جو دین ایک جانور کو بھی غیر فنی اور نامناسب آلے سے ذبح کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو، کیا وہ دفاعی میدان، جراحت کے شعبے یا cyberspace کے بارے میں اناڑی پن سے کام کرنے کی اجازت دے سکتا ہے، یعنی کیا دین یہ گوارا کر سکتا ہے کہ ایک مومن نماز اور روزے کا تو پابند ہو لیکن کمپیوٹر سے نابلد ہو۔ اور اگر کچھ شدبد رکھتا بھی ہو تو ابھی تک windows 95 میں الجھا ہوا ہو۔ گویا پیشہ ورانہ مہارت عین مقصود دین ہے اور تخصص دین کا تقاضا ہے۔

قرآن کریم نے تفقہ فی الدین کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وہی اہم مقام دیا ہے جو دوسری جماعت کو جہاد بالسیف کے حوالے سے دیا ہے۔ اور یہ بات ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ تفقہ نام ہی تخصص کا ہے۔ گہری تحقیق و فکر' بغیر تخصص کے نہیں ہو سکتی۔

آپ کے سوال کا دوسرا پہلو بھی غور طلب ہے' یعنی اسلام میں کیا چیز دنیاوی ہے اور کیا روحانی یا مذہبی؟ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے عبودیت کے تصور کے ذریعے دنیا کے نام پر کیے جانے والے ہر ممکنہ کام کو دین کے دائرے میں شامل کر دیا ہے۔ ایک شخص اگر صبح سے رات تک قرآن کریم کی تلاوت' مطالب پر غور' تفاسیر کا تقابلی مطالعہ' صرف اور نحو کی حدود سے ہر ہر آیت کی محاسن فنی پر تحقیق کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ سرتاپا دین کے کام میں لگا ہوا ہے۔ لیکن اگر ایک شخص صبح سے رات تک اکل حلال کے حصول میں مزدوری' کاشت کاری یا کوئی فنی کام کرتا ہے اور اس کام کے دوران امانت' سچائی' عدل' خوف خدا' پابندی وقت اور مقررہ اوقات میں اللہ کے حضور حاضری کا اہتمام کرتا ہے تو معلوم نہیں کس نص شرعی کی بنا پر اس سارے کام کو دنیاوی کہہ دیا جاتا ہے۔ سورہ الجمعہ نے دین و دنیا کی اس مصنوعی تقسیم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے جس میں ہم معاشی سرگرمی کو محض دنیاوی اور مسجد میں جا کر اللہ کو یاد کرنے کو خالص دین قرار دیتے ہیں۔ فرمایا جاتا ہے: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے" (الجمعہ ۶۲:۹-۱۰)۔

گویا فلاح کے حصول کے لیے نہ صرف مسجد میں بلکہ معاشی کاروبار میں بھی اللہ کا ذکر کرنا ہو گا۔ ہاں اگر تجارت کا مقصد محض حصول مال ہو یا سائنسی تحقیق کا مقصود محض حصول شہرت و منفعت ہو' تو اس کی گنجایش اسلام میں نہیں ہے۔ ایک انجینئر کا اپنے شعبے میں مہارت حاصل کرنا اور اس مہارت کو اسلام کی ترقی کے لیے استعمال کرنا ہی امانت و دیانت ہے۔

ایک شخص کا اپنے پیشے کو ترک کر کے اللہ کی راہ میں ہمہ وقت تبلیغ کرنا اسی وقت اسلام کے مطابق ہو گا جب وہ اپنے دیگر فرائض بھی پورے کر رہا ہو' یعنی بیوی کے حقوق' والدین کے حقوق' اولاد کے حقوق' ہمسائے کے حقوق اور اقربا کے حقوق' نیز اس کے ساتھ ہر سطح پر امر بالمعروف بھی کر رہا ہو۔ اسلام میں انتخاب' دین و دنیا کے درمیان نہیں ہے بلکہ دنیا کو مکمل طور پر دین کے تقاضوں اور مطالبات کا تابع بنانا ہے۔ ایک شخص اپنے پیشے میں رہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے بے شمار ایسے کام کر سکتا ہے جو اسے اپنے پیشے میں بھی کمال کے حصول میں مدد دیں اور اپنے خاندان کے حقوق کی ادائیگی سے بھی غافل نہ کریں۔ اصل ضرورت توازن و عدل کی ہے اور اسلام نام ہی اس توازن و عدل کا ہے جس میں فن کے ساتھ ساتھ' اللہ تعالیٰ کے دین کی ہدایات کو زندگی کے ہر معاملے میں نافذ و رائج کیا جائے۔ واللہ اعلم

باالصواب (پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد)

شفٹوں میں کام کی وجہ سے نماز قضا ہونا

س: میں اپنے والدین کے ہمراہ اپنے آبائی گاؤں سے نقل مکانی کر کے گوجرانوالہ شہر میں پچھلے چار سال سے مستقل رہائش پذیر ہوں۔ میں اپنے گھر سے تقریباً ۱۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر کھیوڑہ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور ہفتہ یا دو ہفتہ بعد گھر لوٹتا ہوں۔ میری بیوی میرے والدین کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس صورت میں مجھے ملازمت کے مقام یا پیدائش کے مقام یا رہائش کے مقام میں سے کس مقام پر نماز قصر ادا کرنا ہوگی؟

میں مذکورہ فیکٹری میں شفٹوں میں کام کرتا ہوں۔ ہر ہفتہ بعد شفٹ بدل جاتی ہے۔ کئی دفعہ رات بارہ بجے سے لے کر دن بارہ بجے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ پھر گھر آکر سو جاتا ہوں۔ اس دوران میری نماز ظہر، عصر اور مغرب قضا ہو جاتی ہے۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ ان نمازوں کو وقت پر ادا کرنا ہوگا یا ان کی قضا پڑھ سکتا ہوں۔ رات کی ڈیوٹی کے بعد گھر آکر سونا بہت ضروری ہے کیونکہ پھر دوبارہ رات کو ڈیوٹی کرنا ہوتی ہے۔ یہ صورت حال مہینے میں آٹھ یا دس دن تک پیش آتی ہے۔

ج: آدمی جس جگہ مستقل طور پر رہائش پذیر ہو وہ اس کا "وطن اصلی" کہلاتا ہے۔ ایک آدمی کے دو "وطن اصلی" بھی ہو سکتے ہیں۔ گوجرانوالہ میں آپ اپنے والدین کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہیں، اور یہاں پر اپنا مکان بنا کر اسی جگہ رہنے کا ارادہ کر لیا ہے تو یہ آپ کا "وطن اصلی" ہے اور مقام پیدائش کو اگر بالکل ترک نہیں کیا، وہاں بھی مکان یا زمین ہے یا مکان ہے تو وہ بھی "وطن اصلی" ہے۔ ان دونوں وطنوں میں جب آپ جائیں گے تو تھوڑا وقت رہیں یا زیادہ، ایک دن رہیں یا دس دن، پوری نماز پڑھنا ہوگی۔ اگر کھیوڑہ میں جائیں تو وہاں نماز قصر کریں کیوں کہ وہ آپ کا "وطن اقامت" ہے۔

ادائیگی نماز کے سلسلے میں عرض ہے کہ نمازیں اپنے وقت پر پڑھنا چاہییں۔ آپ نماز ظہر اور عصر دونوں درمیانی وقت میں پڑھ لیا کریں۔ آج کل اڑھائی بجے سے لے کر تین بجے تک درمیانی وقت ہوتا ہے۔ اس کو "مثل ثانی" کہتے ہیں۔ نمازوں کے لیے جو نقشے مساجد میں آویزاں ہوتے ہیں یا دیگر جگہوں سے دستیاب ہیں، ان میں "مثل ثانی" کے اوقات دیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ نماز مغرب اور عشا بھی درمیانی وقت میں پڑھ لیا کریں۔ یہ درمیانی وقت غروب آفتاب کے پون گھنٹہ بعد سے لے کر ڈیڑھ گھنٹہ تک ہوتا ہے۔

ملازمت یا ڈیوٹی کی وجہ سے نمازوں کو قضا کر لینا جائز نہیں۔ اس کے بجائے ڈیوٹی تبدیل کرائی جائے یا پھر ایسی تدبیر کی جائے کہ درمیانی وقت میں آپ دو شفٹوں میں اپنی نیند بھی پوری کر لیں اور نمازیں بھی

بروقت ادا کرلیں۔ (مولانا عبدالمالک)

صلوٰۃ التسبیح باجماعت

س : کیا صلوٰۃ التسبیح باجماعت ادا کرنا درست ہے؟ ہمارے ہاں جماعت اسلامی سے وابستہ خواتین دعوتی مقاصد کے پیش نظر اہتمام کے ساتھ صلوٰۃ التسبیح ہفتہ وار باجماعت ادا کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ہم اس لیے کرتی ہیں کہ دعوتی اجتماعات میں حاضری عموماً کم رہتی ہے جب کہ صلوٰۃ التسبیح کی وجہ سے حاضری بہتر ہوتی ہے' اس طرح زیادہ افراد تک دعوت پہنچتی ہے۔ رمضان المبارک میں اس کا اکثر مقامات پر باقاعدگی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعض خواتین و حضرات نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ خواتین کا علیحدہ سے باجماعت نماز ادا کرنا درست نہیں ہے۔ صلوٰۃ التسبیح ایک نفلی عبادت ہے جو انفرادی طور پر ادا کرنی چاہیے۔ نیز اس کا مستقل باجماعت ادا کرنا بدعت ہے۔

اس معاملے میں رہنمائی فرمائیں۔ اس لیے کہ دیگر جماعتیں جو دین کے نام پر کام کرتی ہیں وہ بھی اس کا باقاعدگی سے اہتمام کرتی ہیں اور لوگ بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔

ج : شریعت کی یہ مستقل ہدایت ہے کہ اس کے احکام میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کی جائے اور نہ کسی حکم کی حیثیت اپنے پاس سے زیادہ یا کم کی جائے۔

"نماز باجماعت" سے نماز کو ایسی اہمیت ملتی ہے جو انفرادی نماز کو حاصل نہیں ہے۔ نوافل کوئی بھی ہوں ان کی حیثیت انفرادی ہے یعنی لوگ انفرادی طور پر انھیں ادا کریں۔ اگر لوگ نوافل کو اجتماعی اہتمام کے ساتھ اپنے طور پر ادا کرنا شروع کر دیں تو وہ اس کی اصل حیثیت کو بڑھا کر ختم کر دیں گے۔ پھر نوافل کی حیثیت بتدریج پانچ نمازوں اور عیدین کی طرح ہو جائے گی جو صحیح نہ ہو گا۔ اس لیے آپ صلوٰۃ التسبیح اور نفل نمازوں کی ترغیب دیجیے تاکہ لوگ اپنے طور پر ان کی ادائیگی کا اہتمام کریں' گھروں میں یا مساجد میں۔ لیکن انفرادی طور پر ایسا کریں' باجماعت نہیں۔ شریعت کو اپنی اصلی شکل میں رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ کسی کام کو اس بنا پر اجتماعی شکل دینا کہ لوگ اجتماعی شکل دینے سے اس کی طرف زیادہ رخ کرتے ہیں' صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت یہی چیز تو اس کو اجتماعی شکل دینے میں مانع ہے' اس لیے کہ شریعت بعض عبادتوں کو انفرادی عبادت کے مقام میں رکھنا ضروری سمجھتی ہے تاکہ فرائض اور نوافل دونوں شریعت میں اپنے اپنے مقام پر رہیں۔ واللہ اعلم! (ع - م)

کتاب نما

محسن انسانیتؐ، نعیم صدیقی۔ ناشر: فیصل پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۶۲۴۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

سیرت نگاری کا میدان بھی خوب میدان ہے۔ نہ لکھنے والے سیر ہوتے ہیں اور نہ پڑھنے والے۔ آخر اس ہستی کا ذکر ہے جو مسلمان کو ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ نعیم صدیقی کی محسن انسانیتؐ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، جس نے ایک پوری نسل کی تربیت کی اور سیرت کے مطالعے کے صحیح رخ سے آشنا کیا۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے الفاظ اور بیان پر اپنی قدرت کو رسولؐ کی عظمت و محبت سے سرشار ہو کر آپؐ کی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ نہ صرف آپؐ کی شخصیت، بلکہ پورا دور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ جس طرح کا شدید تاثر کسی بہت اچھی فلم کو دیکھ کر ہوتا ہے وہی اس کتاب کی شان ہے۔

یہ کتاب عرصے سے دستیاب نہ تھی۔ اب فیصل پبلشرز نے اس خوش خبری کے ساتھ شائع کی ہے کہ وہ جناب نعیم صدیقی کی دوسری تمام کتب بھی شائع کریں گے۔ نعیم صدیقی صاحب صرف ادیب اور شاعر ہی نہیں، انھوں نے علمی اور فکری تحریریں بھی لکھیں اور کہا جا سکتا ہے ایک پوری نسل کی تعمیر و تربیت میں سید مودودیؒ کے ساتھ ساتھ ان کا بھی غیر معمولی حصہ رہا ہے۔ ہماری موجودہ نسل محسن انسانیتؐ کا مطالعہ کرے تو سیرت کے انقلاب آفریں پیغام تک پہنچے اور نعیم صدیقی صاحب کے مقام کو بھی سمجھے۔

(مسلم سجاد)

الصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمت للعالمینؐ، مرتب: رشید اللہ یعقوب، ناشر: رحمۃ للعالمین ریسرچ سنٹر، ۸ زمزمہ سٹریٹ نمبر ۳، کلفٹن، کراچی ۷۵۶۰۰۔ مجلد مع گردپوش صفحات: ۱۹۲۔ صدقہ جاریہ۔

ایسی کتاب جو دیکھیں تو دیکھتے ہی رہ جائیں! دلکش، خوب صورت طباعت کا شاہکار، موضوع بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود و سلام [اور کیا چاہیے، جب کہ صدقہ جاریہ کے طور پر بغیر قیمت دستیاب ہو!]۔ اس کتاب میں مرتب نے ان درود و سلام کو جمع کیا ہے جن کی رسولؐ نے خود تعلیم دی ہے۔ مرتب نے یہ درود صرف انھی احادیث سے لیے ہیں جو انھوں نے خود دیکھی ہیں۔ اس طرح اس میں ۲۷ درود اور ۱۴ سلام شامل ہیں۔ پہلے باب میں درود و سلام کے بارے میں سورہ احزاب کی آیت اور ان احادیث کو عربی متن کے ساتھ بیان کیا ہے جن میں درود و سلام کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں درود و سلام کے فضائل کے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں ۲۷ طرح کے درود، جن کی احادیث

میں تعلیم آئی ہے' عربی متن اور ترجمے کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ایک مکمل صفحے پر اس درود کی چار رنگ میں نہایت خوب صورت خطاطی فن شہ پاروں کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ۱۴ سلام عربی متن اور ترجمے کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ ہر مقام پر حدیث کا مکمل حوالہ دیا گیا ہے۔ پوری کتاب دبیز آرٹ کاغذ پر ہے' ہر صفحے پر چار رنگ کا پھول دار خوب صورت حاشیہ ہے جس نے کتاب کی صوری معیار کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتب کو جزائے خیر دے اور ایسے اسباب فراہم کرے کہ یہ صدقہ جاریہ جاری رہے۔ (اس ادارے نے قرآن کی بعض سورتیں یٰسین' واقعہ' ملک' مزمل بھی خوب صورت جیبی سائز میں' پڑھنے کے لیے آسان' شائع کی ہیں جو بلاقیمت طلب کی جا سکتی ہیں)۔ (م - س)

لذت فریاد' علامہ عنایت اللہ۔ ناشر: قرآن اکیڈمی' ۵۰ لالہ زار کالونی' منڈی بہاؤالدین۔ صفحات: ۵۳۹۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

انسانوں کا باہمی ربط' گفتگو کے ذریعے ہوتا ہے۔ گفتگو کی ایک مفصل شکل خطابت ہے۔ بہ قول مصنف: "خطاب کا مقصد اپنے سامعین کے دل و دماغ میں اچھے طریقے اور خوب صورت انداز سے اپنی بات اتارنا ہے" (ص ۲۳۳)۔ اہل عرب کو اپنی زبان دانی پر بھی ناز تھا اور خطابت پر بھی' آنحضرتؐ نے اپنے آپؐ کو افصح العرب قرار دیا ہے۔ برعظیم میں نامور علما اور خطیب پیدا ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد' سید عطا اللہ شاہ بخاری' محمد علی جوہر' ظفر علی خان اور متاخرین میں علامہ احسان الٰہی ظہیر نے خطابت میں نام پیدا کیا۔ بعض اہل سیاست نے بھی خطابت میں شہرت حاصل کی۔ ہر سیاست دان کے لیے مقرر ہونا گویا لازمی سمجھا جانے لگا۔

علامہ عنایت اللہ [گجراتی] ایک ممتاز عالم دین ہیں۔ بہ قول شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک: اسلامی تحریک کو جو عظیم خطبا نصیب ہوئے' ان میں علامہ عنایت اللہ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ اسلامی تحریک اور خطبائے پاکستان میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر کامیاب خطابت کی ہے۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر ہیں۔ خطابت کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور اندرون و بیرون ملک ان کی ایک پہچان ہے۔ "لذت فریاد" ان کے تجربات و مشاہدات اور خطابتی سفر کا حاصل ہے۔ (یہ فن تقریر سکھانے والی کتاب نہیں ہے جیسا کہ ڈیل کارنیگی کی کتابیں مشہور ہیں بلکہ یہ فن خطابت پر ایک علمی و تحقیقی مقالہ ہے)۔

کتاب کے مباحث کا دائرہ وسیع ہے۔ قرآن مجید کی آفاقی حیثیت' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت کے انداز' آپؐ کے چیدہ چیدہ اصحاب خصوصاً خلفائے راشدہ کے خطبات کے نمونے' دنیا میں موجود زبانوں کا سلسلہ نسب' الفاظ کا جادو اور عربوں کی فصاحت' اسلام میں آزادی تحریر و تقریر کا تصور' خطابت کی سات قسمیں' بارہ اجزائے خطابت' مولانا نے خطابت کے حوالے سے قیمتی اور عمدہ مواد اکٹھا کیا

ہے۔ حتیٰ کہ بعض متعلقہ سوالات کے جوابات بھی درج کر دیے ہیں۔ بعض مباحث کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر اور کہیں اختصار و تطویل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے' بعض مقامات پر تکرار ہے۔ پہلے باب میں مروجہ زبانوں کے حوالے سے علم الالسنہ کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے لیکن ان کے حوالے نہیں دیے گئے۔

ایک جگہ علامہ صاحب نے لکھا ہے کہ خطابت صرف اہل عرب کی ہے' یہ رائے محل نظر ہے اس کے بجائے شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہوتا کہ خطابت کے میدان میں اہل عرب دنیا کی دیگر اقوام پر سبقت لے گئے ہیں اور دیگر اقوام کا حصہ اس فن میں کمتر ہے۔ بہرحال اصل بات تو یہ ہے کہ علامہ صاحب نے خطبا کی توجہ جن امور کی طرف دلائی ہے ان پر عمل کر کے قوم کو وحدت کی لڑی میں پرویا جا سکتا ہے۔ اگرچہ کتاب خطبہ' خطیب' خطابت' اسلوب' رمز' نفسیات' دعوت دین اور اکیسویں صدی جیسے متفرق موضوعات کا احاطہ کرتی ہے لیکن اس کے اندر دلچسپی کی کئی اور چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ علماے دین' طلبا اور عام قارئین کے لیے یہ کتاب ایک تحفہ ثابت ہو گی۔ (محمد ایوب منیر)

اسلام اور سودی نظام' محمد آصف احسان۔ ناشر: فاران پبلی کیشنز' پوسٹ بکس ۱۰۷۱' فیصل آباد۔ صفحات: ۱۷۴۔ قیمت: ۳۵ روپے۔

عہد حاضر کے معاشی مفاسد کی ایک بڑی وجہ معیشت کے رگ و پے میں سود کے زہر کی موجودگی ہے۔ اس نے نہ صرف تقسیم دولت کے منصفانہ نظام کے قیام کو ناممکن بنا دیا ہے بلکہ اشیا و خدمات کی پیدایش کے بارے میں آجروں کے فیصلوں کا رخ بھی عامتہ الناس کی فلاح و بہبود کے بجائے مترفین کی مسرفانہ عیاشیوں کی طرف موڑ دیا ہے۔ مشرق و مغرب میں سودی نظام کی تلخیوں کا احساس اور اعتراف تو بڑھ رہا ہے لیکن اس کی جگہ غیر سودی نظام کے قیام کی خواہش یا پھر اس کے لیے کوشش ہنوز ناپید ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مغرب کو اپنے معاشی ارتقا کے لیے فراہمی سرمایہ کا' سود کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نظر نہیں آتا۔ غیر سودی بنیادوں پر تشکیل پانے والا معاشی نظام صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیاے معلوم کے بہت بڑے حصے میں اس کے تحت کاروبار معیشت حسن و خوبی کے ساتھ انجام بھی پاتا رہا۔ مغرب تو اپنے روایتی تعصب کی بنا پر اسلام کے اس نظام کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا لیکن مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس کے قابل عمل ہونے کے بارے میں تشکیک کا شکار ہے۔

زیر نظر کتاب میں بڑی بالغ نظری کے ساتھ اس تشکیک کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سودی نظام کے مفاسد کا محاکمہ اور اس کے جواز کے نظریات کا ابطال کیا گیا ہے اور قرآن و سنت کے شواہد اور مفکرین اسلام کی آرا کی روشنی میں سود کی برائی کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روز مرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے بہت سے مسائل مثلاً بنک کے سود' انعامی بانڈ' پروویڈنٹ فنڈ' سیونگ سرٹیفکیٹ اور مارک اپ وغیرہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی اگر اس میں بلاسود بنک کاری کا کوئی ماڈل پیش کر دیا جاتا۔ بہ حیثیت مجموعی غیر سودی نظام پر منتشر مواد کو یکجا کرنے اور اس سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر کو اعتماد کے ساتھ پیش کرنے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ (عبدالحمید ڈار)

قادیانیت سے اسلام تک' محمد متین خالد۔ ملنے کا پتا: مکتبہ تعمیر انسانیت' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۵۴۳۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

اس کتاب میں جناب مولف نے ان ۲۸ خوش نصیب انسانوں کے حالات یکجا کر دیے ہیں جنھوں نے قادیانیت کی آغوش میں آنکھ کھولی' اور ایک عرصے تک اسی گمراہی میں مدہوش و مگن زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے ان پر یہ حقیقت کھول دی کہ قادیانیت اسلام کے بہروپ میں کفر و فسق اور ضلالت کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں مولانا لال حسین اختر' زیڈ اے سلہری' شفیق مرزا' میجر جنرل (ر) فضل احمد' م ب خالد' ایئر کموڈور رب نواز' مرزا محمد سلیم اختر اور بہت سے دوسرے حضرات شامل ہیں جنھوں نے ربوہ کے اندر قائم اسٹیٹ' وہاں کے "خلیفہ" نظارتوں کے ذمہ داران اور نظم و نسق سے متعلق افراد کے کردار کے بارے میں ایسی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ مرزائیت کو کھڑا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے چہرے کو مسخ کرے' اخلاقیات کو دریا برد کرے اور اسلام کو (جہاد کے بغیر) ایک ایسا دین بنا کر پیش کرے کہ امت مسلمہ' یہودیوں' عیسائیوں اور ہندوؤں کے لیے نرم چارہ ثابت ہو۔

اس کتاب کی ایک اور خوبی ان غیر ملکی حضرات کی روداد ہے کہ جنھوں نے نائیجیریا' انڈونیشیا' فلسطین' جرمنی' برطانیہ اور دنیا کے دیگر حصوں سے آکر اسلام ترک کیا اور مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار بن گئے' لیکن جب انھوں نے بنظر غائر اسلام کا مطالعہ کیا۔ دین کی بنیادوں کو سمجھا' مرزا قادیانی کے خاندان کا گھناؤنا کردار دیکھا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری نام نہاد دین داری' پیٹ پوجا کے سوا کچھ نہیں ہے تو انھوں نے حق کی طرف لوٹنے میں کوئی تاخیر نہیں کی اور خاتم النبیین کے سایہ عاطفت میں پناہ لی۔ یہ تمام داستانیں چشم کشا' ایمان افروز اور معلومات افزا ہیں۔

قادیانیت نے برعظیم سے باہر نکل کر مغربی دنیا اور افریقہ کو اپنا نشانہ بنا رکھا ہے' اور بعض افریقی ممالک کو تو وہ "احمدی" ریاستوں میں تبدیل کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اگرچہ وہاں انھیں زک اٹھانی پڑی ہے اور جنوبی افریقہ اور گمبیا میں انھیں غیر مسلم قرار دیا گیا ہے' مگر انٹرنیٹ پر وہ اسلام کے حقیقی نمایندے بنے ہوئے ہیں' مبشرین و مبشرات کا سلسلہ جاری ہے وہاں ان کا لٹریچر بھی شائع ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ زیر نظر کتاب کے منتخب حصے' دیگر زبانوں میں ترجمہ کر کے' ان لوگوں تک پہنچائے جائیں

جنھیں قادیانیوں نے اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔

جناب محمد متین خالد نے ایک ڈیڑھ برس پہلے "ثبوت حاضر ہیں" شائع کی تھی (تبصرہ ترجمان القرآن مئی ۱۹۹۸' ص ۶۱-۶۲)۔ زیر نظر کتاب کے دیباچے میں انھوں نے بتایا ہے کہ اس کے مطالعے سے کئی قادیانی حضرات' تائب ہو کر اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ امید ہے یہ کتاب بھی سعید روحوں کو اسلام کی طرف کھینچ لائے گی۔

مرتب نے جس پر خلوص جذبے' سچی لگن اور انتہائی جانفشانی سے یہ کتاب مرتب کی ہے' وہ قابل داد ہے۔ کتابت' طباعت' سرورق اور اہتمام ظاہری کے لحاظ سے بھی کتاب معیاری ہے۔ (م - ا - م)

بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں' از عبدالعلیم اصلاحی' ناشر: جامعۃ البنات' سعید آباد' حیدر آباد' مدھیہ پردیش (بھارت)۔ صفحات: ۳۲۔ قیمت: پانچ روپے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندو انتہا پسندوں کے ہاتھوں بابری مسجد کی شہادت امت مسلمہ کے لیے ایک ایسا حادثہ فاجعہ ہے' جس پر اگر کسی کا دل نہ تڑپے تو اسے اپنے ایمان اور دینی حمیت کی خبر لینی چاہیے۔ ریاستی مشینری کی چھتری تلے یہ وحشیانہ عمل ہوا' اس کو روکنا عام مسلمانوں کے بس میں نہ تھا۔ آج بھی مسلمانوں کے دل اس زخم کی ٹیسیں اور چبھن محسوس کرتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے مسلمان دانش ور بھی ہیں جو مداہنت کو حکمت کی گولی قرار دے کر حلق سے اتارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں ایک نام دہلی کے وحید الدین خان صاحب کا ہے جن کی مساعی کو بھارتیہ جنتا پارٹی اور بھارتی کانگریس پارٹی اس لیے بہ نظر استحسان دیکھتی ہے کہ خان صاحب بھارت میں مسلمانوں کے ہر نقصان کو خود مسلمانوں کی غلطی قرار دیتے ہوئے' انھی مظلوموں کو طعن کا نشانہ بناتے ہیں۔ اسی تسلسل میں وہ نت نئی تاویلات کر کے مسلمانوں کو فکری اور عملی پسپائی کے مختلف گر سیکھنے اور سکھانے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ بابری مسجد کی شہادت کے واقعے کے بعد انھوں نے اپنے جریدہ الرسالہ (مئی ۹۳) میں ایک سہ نکاتی فارمولا (بلکہ فتویٰ سا) پیش کیا۔ جس میں مسلمانوں کو "حکم" دیا کہ: "حکم اضطرار کے تحت ان [مسلمانوں] کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلے سے الگ ہو جائیں' تاکہ اپنے آپ کو مزید ذلت اور ہلاکت سے بچا سکیں.... ہمارا ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عین مطابق ہو گا" (ص ۸)۔

عبدالعلیم اصلاحی صاحب نے اس فکر کا تعاقب کرتے ہوئے زیر تبصرہ مقالے میں لکھا ہے: "بلاشبہ نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا درست ہے' لیکن وحید الدین صاحب نے کام کا نقشہ بنانے کے نام پر کام کو ختم کرنے کی آواز اٹھائی ہے....." (ص ۲)۔

عبدالعلیم صاحب نے خان صاحب کے فارمولے کا قرآن' سنت اور نظائر کی روشنی میں مدلل تجزیہ

کرتے ہوئے لکھا ہے: "بابری مسجد سے بے تعلق ہونے کو ملک [بھارت] کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں کی جان بخشی کے لیے ضروری قرار دے کر گویا سارے مسلمانوں کو ذہنی طور سے تیار کرایا جا رہا ہے، ۳۰ ہزار مساجد سے بے تعلق ہونے کے لیے کیونکہ جس بنیاد پر ایک [بابری] مسجد کو چھوڑا جا سکتا ہے، اس بنیاد پر کسی بھی مسجد کو چھوڑنا "جائز" ہو گا" (ص ۶-۷)۔

اس نقصان پر تڑپنے والوں کو مشورہ دینے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، صاحب مقالہ نے بتایا ہے کہ: "یہی وہ چیز ہے جو منافقین کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، جس کی بنا پر، اللہ کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو [وہ] بے وقوف "سفہا" کہتے تھے" (ص ۵)۔ عبدالعلیم صاحب نے بتایا ہے کہ: "اس نقطہ نظر سے مسجد کے لیے کوئی [بھی] جدوجہد بے نتیجہ نہیں ہے۔ مسجد بنے یا نہ بنے، جو لوگ اس راہ میں جان و مال کی قربانی، اخلاص نیت کے ساتھ پیش کریں گے، ان کا یہ عمل بے انتہا نتیجہ خیز ہو گا" (ص ۵)....

اور "یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ مسلمان بابری مسجد کا نام لینا بند کر دیں تو مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ قرائن و شواہد بتاتے ہیں کہ یہ سلسلہ آسانی سے بند ہونے والا نہیں ہے۔ بہرصورت ہمیں ایک لمبی مزاحمت اور کش مکش سے گزرنا ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ [اب صرف] ایک مسجد کا اور مقامی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کا رشتہ اب عالمی سیاست سے جڑ چکا ہے۔ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کی جو کارروائیاں اور سازشیں چل رہی ہیں، مسلمانان ہند کے تحفظ کا مسئلہ ان کا ایک جزو ہے" (ص ۷)۔ جب کہ "یہ نکاتی فارمولا انہدام مسجد اور تعمیر بت خانہ پر مسلمانوں کی رضامندی کے اظہار کا مطالبہ کرتا ہے، اور دھمکی دے رہا ہے کہ [اگر] ایسا تم نہ کرو گے تو نیست و نابود ہو جاؤ گے [حالانکہ] ظلم کو ظلم اور ظالم کو ظالم کہنا ملت اسلامیہ کی زندگی کی علامت ہے۔ بابری مسجد کو منہدم کرنے والے قرآن کی رو سے ظالم ہی نہیں، بلکہ اظلم ہیں۔ ان کے ظالمانہ اقدام پر کوئی غیرت مند مسلمان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں" (ص ۳۱-۳۲)۔

نام نہاد روشن خیالی کے نام پر حق میں باطل کو ملانے والے گروہ کی قلم درازیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ مقالہ اہمیت کا حامل ہے۔ (سلیم منصور خالد)

اسلامی شریعت کے بنیادی معاشی تصورات، سید معروف شاہ شیرازی۔ ناشر: سید عارف شیرازی، ادارہ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۸۸۔ قیمت: ۴۵ روپے۔

عصر حاضر کے بہت سے مسلم مفکرین نے اسلامی نظام معیشت کے مختلف پہلوؤں اور تصورات کو واضح کیا ہے۔ ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے نام نمایاں ہیں۔ یہ کتاب فی ظلال القرآن کے مترجم اور متعدد

کتابوں کے مصنف سید معروف شاہ شیرازی کی ایک مختصر مگر عمدہ کاوش ہے۔ دراصل یہ انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی (اسلام آباد) کے مختلف شعبوں میں کی جانے والی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

مصنف نے قرآن و سنت کے نصوص کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کے معاشی تصورات پر بحث کی ہے۔ کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: عادلانہ معیشت' معاشی جدوجہد' غربت کے خلاف جہاد' عام معاشی پالیسی اور زرعی پالیسی۔

مصنف نے جہاں عالمی تناظر میں معاشی حالات کو پیش نظر رکھا ہے وہاں ملکی حالات کو بھی نظرانداز نہیں ہونے دیا۔ انداز استدلال قرآن و سنت اور تعبیرات مسلمہ کے مطابق عام فہم اور اطلاقی ہے۔ اسلام کے معاشی تصورات کی تفہیم کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ مآخذ و مصادر کی فہرست بھی دینی چاہیے تھی۔ (محمد عبداللہ صالح)

پیام لطیف' تحقیق و تحریر: پروفیسر آفاق صدیقی۔ **اقوال سچل**' تحقیق و تحریر: پروفیسر آفاق صدیقی۔ **دانش ایاز**' تحقیق و ترجمہ: آصف فرخی' شاہ محمد پیرزادہ۔ ناشر: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ' اردو بازار' کراچی۔ ہر ایک کے صفحات ۱۹۲' سائز: جیبی۔ قیمت: ۴۰ روپے۔

کسی کتاب کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ اسے آسانی سے پڑھ لیا جائے۔ سندھ کی تین عظیم شخصیات کی تحریروں سے' مقولات کے طرز پر' یہ انتخاب اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ چند جملوں میں' بعض اوقات ایک ہی جملے میں' ایسی حقیقت آشکار کر دی جاتی ہے یا آشکار حقیقت اس انداز سے پیش کر دی جاتی ہے کہ قلب و ذہن پر اثر کر جاتی ہے۔ ان کتابوں کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اردو پڑھنے والے سندھ کی دانائی سے آشنا ہوتے ہیں اور اس طرح مغائرت کے کچھ پردے ہٹ جاتے ہیں' اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر کتاب کے آغاز میں شخصیت کے حالات کا بیان ہے۔ پھر اس کے بارے میں چند آرا پیش کی گئی ہیں اور پھر ایک صفحے پر ایک بات کا سلسلہ ہے۔

شاہ لطیف (۱۶۷۸ - ۱۷۵۲) سندھ کے مقبول ترین صوفی شاعر ہیں۔ آپ کا شاہ جو رسالو دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کتاب سے ان کے چند اقوال:

۱۔ ناقہ [نفس] کے پاؤں میں مضبوط زنجیریں ڈال دو' اگر آزاد چھوڑو گے تو بہک جائے گا' یہ بدک جائے تو مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ ۲۔ آب رواں جن کا مسکن ہو' وہ نادان تشنہ لب رہیں' یہ ایسا ہی ہے جیسے رگ جان سے قریب تر رہنے والے محبوب کو ہم نہ اپنائیں۔ ۳۔ اے سوالی! اس سے مانگ جو ہر روز دیتا ہے۔ دنیا کے چھوٹے دروازوں پر کیوں صدا لگاتا ہے' یہ دے کر کل تجھے طعنے دیں گے۔ ۴۔ آدمی کی بساط ہی کیا ہے جیسے کوئی حباب پھوٹ گیا یا کسی پرفشاں پرندے سے دفعتاً آشیانہ چھوٹ گیا۔ ۵۔ برکھا رت

آئی' بادل چھائے' کسانوں نے ہل اٹھائے' غلہ بان مسرور و شادمان ہوئے۔ آج پھر میرا محبوب لباس باراں میں ملبوس ہوا ہے۔

سچل سرمست (۱۷۳۹ - ۱۸۲۷) کے جد امجد محمد بن قاسم کے مشیر کی حیثیت سے سندھ آئے اور سیہون کے گورنر بنائے گئے۔ سچل سرمست بھی سندھ کے مشہور صوفی شاعر ہیں اور ان کا عرس اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ آپ کے بعض اقوال:

۱۔ نفس کو تین چیزوں سے قابو میں رکھا جا سکتا ہے: خاموشی کے خنجر سے' بھوک کی تلوار سے اور تنہائی کے نیزے سے۔ ۲۔ کنواں کھودنے کے لیے ڈھیروں مٹی کھودی جاتی ہے' تب کہیں ان دیکھے پانی کی شکل نظر آتی ہے۔ یہ غیب پر یقین رکھنا ہی تو ہے جو زمین کی تہوں سے پانی برآمد کرتا ہے۔ ۳۔ میں نے عالموں اور حافظوں کی بے عملی دیکھی' قاضیوں کی بے خبری' شریفوں کو غم و اندوہ میں پایا اور کمینوں کو موج اڑاتے دیکھا۔ زاہد و عالم' حاکم کے در پر خراب و کھجل۔ ضمیر فروش عالم کمینی دنیا کے پھیر میں سرگرداں' کتوں کے گلوں میں سونے کے گلوبند۔

شیخ ایاز (۱۹۲۳ - ۱۹۹۷) جدید دور کے سندھ کے مشہور دانش ور تھے۔ سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ اردو میں بھی مجموعہ کلام شائع ہوئے ہیں۔ ان کی شہرت ایک ملحد اور قوم پرست کی رہی لیکن آخری ایام میں انھیں ایمان کی سعادت حاصل ہوئی۔ سندھی میں ان کی دعاؤں کی کتاب بہت مقبول ہوئی ہے۔ چند اقتباسات:

۱۔ اگر میری شاعری تمھیں خدا کے وجود کا ثبوت نہیں معلوم ہو رہی' تو پھر تمھیں اور کیا ثبوت چاہیے۔ ۲۔ تہذیب کے کئی معانی ہیں: صارفین کے لیے زیادہ سے زیادہ چیزیں' عارفین کے لیے کم سے کم۔ ۳۔ مشتری اور مریخ بہت دور ہیں' تم ان سے بھی آگے دیکھو' اپنے اندر!

فضلی سنز نے طباعت میں نام پیدا کیا' اب اپنی چھاپ بھی لگا دی ہے۔ ۲۰ ویں صدی کے اختتام اور اکیسویں کی آمد پر مغرب میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کیلنڈر انھی کا چلتا ہے' اس لیے ہمیں بھی کچھ سوچنا اور کرنا چاہیے۔ کیوں نہ کوئی ادارہ مسلم نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے صدی کی ۱۰ اہم ترین شخصیات کے اس طرح کے مجموعے تیار کرے اور شائع کرے۔ کیوں نہ فضلی سنز ہی! (م - س)

مدیر کے نام

رضوان احمد فلاحی، برطانیہ

والد گرامی [صدر الدین اصلاحی] رحمۃ اللہ علیہ پر ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کی تاثراتی تحریر (دسمبر ۹۸) پر ادارے کی جانب سے تعارفی نوٹ میں بعض معلومات سہواً غلط درج ہو گئی ہیں۔ ریکارڈ درست کرنے کی خاطر عرض ہے۔

۱۔ آبائی گاؤں قصبہ پھول پور نہیں، بلکہ سیدھا سلطان پور ہے۔ البتہ گذشتہ کئی سالوں سے رہائش پھول پور میں رہی جو سیدھا سلطان پور سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور بڑا قصبہ ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا شفیعؒ ان کے صاحبزادے اور اردو ادب کی مشہور شخصیت ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا تعلق بھی سیدھا سلطان پور سے رہا ہے۔ والد مرحوم کا انتقال قصبہ پھول پور ہی میں ہوا۔

۲۔ ترجمان القرآن کے اولین دور میں ان کا مقالہ "نکاح کے اسلامی قوانین" کے نام سے نہیں بلکہ "نکاح کتابیہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ان کی اولین تحریری کاوش تھی جو ترجمان القرآن، جلد ۱۰، مارچ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسی جلد کے جولائی تا ستمبر ۱۹۳۷ء کے تین شماروں میں ان کی اولین تحریکی تحریر "مسلمان اور امامت کبریٰ" شائع ہوئی۔ یہ دونوں تحریریں اس وقت کی ہیں جب وہ مدرسۃ الاصلاح میں زیر تعلیم تھے۔ ثانی الذکر تحریر ان کے انتقال سے قبل کتابی شکل میں شائع ہو چکی تھی، لیکن اسے دیکھنے سے قبل ہی وہ اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ اس طرح ان کی زندگی کی اولین تحریکی تحریر، آخری تحریر بن گئی۔ جہاں تک "نکاح کے اسلامی قوانین" کا تعلق ہے تو وہ ان کی ایک مستقل تصنیف ہے جو پہلی بار ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

۳۔ مرحوم نے متعدد مواقع پر قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند کے فرائض انجام دیے ہیں، لیکن آپ قیم جماعت کبھی نہیں رہے۔

زاہد رشید، کراچی

سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "المرتضیٰ" پر تبصرہ (دسمبر ۹۸) کرتے ہوئے فاضل تبصرہ نگار نے لکھا: "....اگرچہ یہ غیر مکمل بلکہ ناقص ہیں۔ ان شخصیات میں بعض اہم ناموں کا تذکرہ نہیں ہوا حتیٰ کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی اسلامی تحریک جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام بھی غائب ہے"۔ فاضل تبصرہ نگار کے ان جملوں سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ انھیں ناقص در حقیقت اس وجہ سے سمجھ رہے ہیں کہ اس میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام نہیں۔ میرے خیال میں کسی بھی تبصرہ نگار کو اس قسم کی جانب داری زیب نہیں دیتی۔

عثمان عباسی، لاہور

"آیئے حالات درست کریں" (جنوری ۹۹) میں لکھا گیا ہے: "مسلمانوں کے معاشرے میں تو خودکشی کرنے والوں کی نماز جنازہ تک نہیں پڑھی جاتی (ص ۶)۔ عملاً ایسا نہیں ہے اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھنا منع ہے۔ جس طرح زانیوں اور بدکاروں کی نماز جنازہ میں، معاشرے کے ارباب فضل کی شرکت کو پسند نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح اس کی بھی صورت ہے۔ مقروض کی نماز جنازہ رسولؐ اللہ خود نہ پڑھاتے تھے۔ خودکشی کو اخلاقی زوال کا ثبوت قرار دینا بھی محل نظر ہے۔ اس کی اصل وجہ شدید معاشی

تنگ دستی اور معاشرے کا دباؤ ہے۔

عبدالرشید بھٹی' کراچی

"تعلیمی اداروں کی ثقافت" (جنوری ۹۹) میں پروفیسر عبدالقدیر سلیم صاحب نے نہایت اہم مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں کوئی مثبت تبدیلی' آنا ہے' تو اس کی بنیاد تعلیمی اداروں سے اٹھنا چاہیے۔ یہاں کی صورت حال دیکھ کر تو مستقبل کے بارے میں تشویش ہی تشویش ہوتی ہے۔ مسائل اتنے سادہ نہیں کہ ایک غیر امتحانی نصاب تجویز کرنے سے حل ہو جائیں۔ قومی سطح پر عزم نو کے ساتھ اقدامات کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کون کرے؟

عبداللہ گوہر' کراچی

"انڈونیشیا: بحرانوں کے درمیان راستے کی تلاش" (جنوری ۹۹) میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ مسلم ممالک میں عوام کی جدوجہد کے ثمرات عوام تک نہیں آتے۔ غالباً اسی لیے عوام بیدار ہونے کو بے فائدہ جان کر' بیدار ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ماجد صدیقی' اسلام آباد

"اسلامی تحریکات کا نظام تربیت و تزکیہ" (جنوری ۹۹) ایک غیر معمولی کاوش ہے جس پر فاضل مقالہ نگار تبریک کے مستحق ہیں۔ جو افراد تربیت کے ذمہ دار ہیں اور جن کی تربیت ہونا ہے' دونوں ہی خوب استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن خواہش اور ارادہ شرط ہے۔ غالباً تربیت کا بنیادی مسئلہ بھی یہی ہے: اپنا ارادہ اور عزم۔

ڈاکٹر فیض محمد بلوچ' کوئٹہ

نیا ٹائٹل سادہ ہے' آنکھوں کو بھاتا ہے۔ اشارات امید و حوصلہ دلاتے ہیں اور حکمت مودودی" قرآن و حدیث کی سچائی اور اسلام پر مزید ثابت قدمی کی راہ دکھاتی ہے۔ "قبر اور آخرت کی تیاری" پکار پکار کر دنیا کی بے ثباتی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس شمارے (جنوری ۹۹) کا ہر مضمون ہی خوب سے خوب تر ہے۔ معاصر اسلامی تحریکات کے نظام تربیت و تزکیہ کے آئینے میں اپنی تحریک کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ خیر خواہ کے دعوتی اشتہار تذکیر کا باعث اور بلغواء عنی ولو آیة کے مصداق ہیں۔

حضرت عمرو بن عبسہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب رات کے وقت ہوتا ہے۔ پس اگر تم سے ہو سکے کہ رات کے وقت میں اللہ کو یاد کرنے والے ہو، تو ضرور ہو۔ (ترمذی)

ق، مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر د-اے ذیلدار پارک ۱ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,

زخمی، معذور اور بیمار مجاہدین، مہاجرین کا ادارہ

آئیے!

ان زخموں پر مرہم رکھنے میں
ہمارا ساتھ دیجئے





آپ کا تعاون کسی زخمی مجاہد کو
صحت دینے کا سبب بنے ...!
اور آپ کیا چاہتے ہیں ...؟

کشمیر سرجیکل ہسپتال

زیر اہتمام: پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

اکتوبر 1990 سے مجاہدین اور مہاجرین کو مفت طبی امداد فراہم کر رہے۔

اکتوبر 1990 سے جون 1998 تک 2 لاکھ 85 ہزار مریضوں کا علاج کیا گیا۔

22500 سے زائد مریض مختلف ہسپتالوں کو ریفر کئے گئے۔

1000 سے زائد افراد کو فراسٹ بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچا لیا گیا۔

تمام تنظیموں کے مجاہدین کیلئے فرسٹ ایڈ مہیا کی جا رہی ہے۔

جہاں ہر روز 150 سے 250 تک مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے۔

ہسپتال کے زیر اہتمام چار مستقل ڈسپنسریاں اور دو ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں۔

کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت فرسٹ ایڈ سنٹر کام کر رہے ہیں۔

معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضا لگائے گئے۔

دو نئے وارڈز کی تعمیر کی جا رہی ہے جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جا رہی ہیں۔

کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے؟

خوش نصیب ہے
جو گھر بیٹھے...

- غزوہ ہند میں شریک ہے۔
- اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے۔
- زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت و عبادت کا ثواب لے رہا ہے۔
- عظیم ملی فریضہ کی ادائیگی کر رہا ہے۔

کشمیر سرجیکل ہسپتال سے تعاون کیجئے

ڈاکٹر محمود حسین کیانی (میڈیکل سپرنٹنڈنٹ)

کشمیر سرجیکل ہسپتال، پولٹری فارم روڈ، مظفر آباد، آزاد جموں و کشمیر۔ فون: 3700-0581

اکاؤنٹ نمبر: 1-1128 حبیب بینک لمیٹڈ، چہلہ بانڈی مظفر آباد۔

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں